تعلیم و تربیت

جون 1995ء

Sharjeel Ahmed

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Sharjeel Ahmad Warsi
Date
No.

السلامُ علیکم

جب کسی کو اُس کی محنت کا صِلہ ملے تو وہ خوشی سے پُھولا نہیں سماتا۔ (سب سے اچھا صِلہ اُس کے کام کی تعریف ہے)۔ کچھ ایسی ہی حالت اِس وقت ہماری ہو رہی ہے۔ سال نامے کی تعریف میں آپ کے خطوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور ہم انہیں پڑھ پڑھ کر خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ آپ کا بہُت بہُت شکریہ کہ آپ نے تعلیم و تربیت کے 55 ویں سال نامے کو پسند کیا اور اپنی پسندیدگی سے ہمیں بھی آگاہ کیا۔

Sharjeel Ahmed

بعض ساتھیوں نے، جن کی تعدا آٹے میں نمک کے برابر ہے، لکھا ہے کہ اُنہیں سال نامہ دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ اِس خاص نمبر کے کم از کم دوگُنے صفحات ہوں گے۔ یہ لکھتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ اگر ہم سال نامے کے صفحات دوگنے (128) کر دیتے تو اُس کی قیمت 30 روپے ہوتی۔ اب اِس مہنگائی کے زمانے میں جب کہ درمیانہ درجے کے گھرانوں کا کھانے پینے کا خرچ ہی مشکل سے چل رہا ہے، کتنی مائیں ایسی ہوں گی جو اپنے بچّوں کو رسالہ خریدنے کے لئے 30 روپے، آسانی سے، دے دیں گی؟ ایسی بات کرتے وقت صرف اپنی ہی جیب نہ دیکھیں، دوسروں کی جیبوں پر بھی نظر ڈال لیا کریں۔

اِس مہینے کی پہلی تاریخ سے اسکولوں میں تین ماہ کی چھٹّیاں ہو رہی ہیں۔ یہ چھٹّیاں آپ کہاں گزاریں گے، اِس کا فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ بہرحال، اِس خطرناک موسم میں سیرسپاٹا کرنے اور کھانے پینے میں اِحتیاط کریں۔ لُو سے بچیں اور دوپہر کے وقت ہرگز باہر نہ نکلیں۔ اگر باہر جانا بہت ضروری ہو تو گردن، سر اور مُنہ کو موٹے کپڑے سے ڈھانپ لیں۔ البتّہ راستے میں کوئی پولیس والا مل جائے تو ڈھاٹا کھول کر اُسے اپنا چہرہ دکھا دیں۔

تین مہینے کی اِن چھٹیوں میں اکثر ساتھی، سیرو تفریح کے لئے، کہیں نہ کہیں ضرور جائیں گے۔ جب وہ واپس آئیں تو وہاں کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر ہمیں بھیجیں۔ ہم خوشی سے چھاپیں گے اور لکھنے والوں کو اِنعام بھی دیں گے۔ مضمون بڑے سائز کے تین صفحات سے زیادہ نہ ہو اور ایک سطر چھوڑ کر لکھا گیا ہو۔ اڈیٹر

اس شمارے میں

اداریہ		1
اے میرے خدا (نظم)	قتیل شفائی	2
جادو کا موتی (کہانی)	سعید لخت	3
دادی اماں (کہانی)	محمد یونس حسرت	6
درس قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	12
تخت و تاج کی قیمت (سنہری چڑیا)	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	13
مداری (کہانی)	سلیم احمد صدیقی	15
باتیں بڑوں کی		21
با عنوان (کہانی)	اشفاق احمد خاں	22
آئی گرمی (نظم)	تعارف اللہ خاوری	25
مردہ واپس آگیا (کہانی)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	26
کیا کیوں کیسے		30
دوستی کا امتحان (کہانی)	رفعت شاہین	32
اے وطن میرے وطن (کہانی)	عفت گل اعزاز	36
بلّیوں والی خالہ (کہانی)	حنا خیری	41
دل چسپ و عجیب		45
آیئے مسکرائیں (لطائف)		47
آپ بھی لکھئے		49
آپ کا خط ملا		54
موت کا کھیل (کہانی)	سلیم خاں گمی	57
نگین کی پُھل جھڑیاں		63

اے میرے خدا

قتیلؔ شفائی

اے میرے خدا، اے میرے خدا
تُو مجھ کو سیدھی راہ دکھا
اے میرے خدا، اے میرے خدا

جو رستہ ہے میرے پیغمبرؐ کا
تُو مجھ کو اُس رستے پہ لگا
کوئی گورا ہو یا کالا ہو
کوئی کہیں کا رہنے والا ہو
تو سب کا مجھے ہمدرد بنا
اے میرے خدا، اے میرے خدا

خود تیرا حکم ہے میرے لئے
کام آؤں تیرے بندوں کے
میں بھی اِک بندہ ہُوں تیرا
نہیں شوق فرشتہ بننے کا
تو صِرف مجھے اِنسان بنا
اے میرے خدا، اے میرے خدا

اپنے ہی لئے میں جیا تو کیا
اپنا ہی گریباں سِیا تو کیا
میں جاگتے میں کیوں سویا رہوں
کیوں اپنی ذات میں کھویا رہوں
اوروں کا مجھے غم خوار بنا
اے میرے خدا، اے میرے خدا

جادو کا موتی

ویت نام کے کسی گاؤں میں ایک شکاری رہتا تھا۔ نام تھا، ڈاٹرانگ۔ نام ذرا مشکل ہے، لیکن کیا کریں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں (ویت نام، کمبوڈیا، لاؤس، سنگاپور، انڈونیشیا، تھائی لینڈ وغیرہ) کے لوگوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تو خیر، اس ڈاٹرانگ کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ بالکل اکیلا ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ ایسے ہی آدمی کے بارے میں کہتے ہیں: جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔ جورو بیوی کو کہتے ہیں۔ جاتا کا مطلب ہے، ذات برادری۔ اور ناتا کے معنی ہیں، رشتہ۔ ناتا کو بہت سے لوگ ناطہ لکھتے ہیں جو ایسا ہی غلط ہے جیسے گرم مسالا کو گرم مصالحہ لکھنا۔ اچھا، اب کہانی سنیے۔

ایک دن ڈاٹرانگ جنگل میں شکار تلاش کر رہا تھا کہ اسے ایک شکرا نظر آیا، جو نیچے، زمین پر، رینگتے ہوئے ایک سانپ پر جھپٹنے ہی والا تھا۔ نہ جانے کیوں، ڈاٹرانگ کو سانپ پر ترس آگیا۔ اس نے تیر مار کر شکرے کو مار گرایا۔

سانپ بھاگتے بھاگتے رک گیا، پھن اٹھا کر ڈاٹرانگ کو دیکھا، اور پھر بولا "تمہارا بہت بہت شکریہ، ڈاٹرانگ۔"

ڈاٹرانگ نے حیرت سے آنکھیں ملیں تو سانپ نے کہا "حیران نہ ہو۔ میں سانپ نہیں، پانی کی روح ہوں۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں اس کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ لو۔ یہ جادو کا موتی ہے۔ اسے زبان کے نیچے رکھو گے تو دنیا کے ہر جانور کی بولی کا مطلب سمجھ سکو گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اپنے اس علم کو نیک کاموں میں استعمال کرنا۔" اور اس سے پہلے کہ ڈاٹرانگ کا حیرت سے کھلا ہوا منہ بند ہوتا، سانپ غائب ہوگیا۔

اسی وقت ڈاٹرانگ کو ایک پہاڑی کوے کی کائیں کائیں سنائی دی۔ اس نے جادوئی موتی زبان کے نیچے رکھا اور کوے کی کائیں کائیں کی طرف کان لگا دیئے۔ کوا کہہ رہا تھا "یہاں قریب ہی ایک جھاڑی میں ایک موٹا تازہ ہرن بیٹھا ہے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ اس کی کلیجی مجھے دو گے تو میں تمہیں وہاں لئے چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے" ڈاٹرانگ بولا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہرن کی کلیجی تمہیں دے دوں گا۔"

کوا ڈاٹرانگ کو اس جھاڑی کے پاس لے گیا جس میں ہرن بیٹھا تھا۔ ڈاٹرانگ نے تیر سے ہرن کو شکار کیا، اس کی کلیجی کوے کو دی اور گوشت گھر لے گیا۔ اس دن سے وہ

دونوں مل کر شکار کرنے لگے۔ دونوں خوش تھے۔ ڈاڑانگ کو شکار کے لئے زیادہ دوڑ دھوپ کرنی نہیں پڑتی تھی' اور پہاڑی کوے کو مفت میں کلیجی مل جاتی تھی۔

ایک دن کوے کو آنے میں دیر ہوگئی تو ڈاڑانگ اکیلا ہی شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک پاڑا مارا اور اس کی کلیجی درخت کی شاخ پر رکھ دی کہ کوا آکر کھالے گا۔ لیکن وہ کلیجی کوئی دوسرا پرندہ کھا گیا۔ اتنے میں کوا کائیں کائیں کرتا ہوا آگیا۔ اسے کلیجی نہیں ملی تو اس نے ڈاڑانگ کو خوب برا بھلا کہا۔ ڈاڑانگ کو غصہ آگیا۔ اس نے کمان میں تیر لگایا اور کوے کا نشانہ لے کر چھوڑ دیا۔ کوا اچھل کر ایک طرف ہوگیا اور تیر کچھ دور جاکر زمین پر گر پڑا۔

اب تو کوا غصے سے تن فن ہوگیا۔ چیخ کر بولا "پہلے تم نے وعدہ خلافی کی اور اب میری جان لینے کی کوشش کی۔ تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ تم احسان فراموش ہو۔" یہ کہہ کر اس نے تیر کو چونچ میں دبایا اور گاؤں کی طرف اڑ گیا۔ گاؤں کے پاس ایک نہر تھی۔ اس نہر میں کسی آدمی کی لاش پڑی تھی۔ شاید ڈوب کر مرگیا تھا۔ کوے نے ڈاڑانگ کا تیر مردے کے جسم میں گھونپ دیا' اور جنگل کی طرف اڑ گیا۔

کچھ دیر بعد چند لوگ نہر کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے نہر میں لاش دیکھی تو رک گئے۔ لاش میں تیر لگا ہوا تھا۔ یہ تیر ڈاڑانگ کا تھا۔ انہوں نے پولیس کو خبر کردی' اور پولیس نے ڈاڑانگ کو قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا۔

اب بے چارہ ڈاڑانگ جیل کی کال کوٹھری میں پڑا آہیں بھرتا تھا۔ اس کوٹھری میں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ اس کے ساتھ باتیں کرکے دل بہلاتا۔ بس مکھی مچھر تھے یا پسو اور چوہے جو ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ ڈاڑانگ نے سوچا' چلو انہی کی باتیں سن کر وقت گزاروں۔ اب وہ' صبح ہوتے ہی' جادوئی موتی زبان کے نیچے رکھ لیتا اور ان جانوروں کی باتیں سنتا۔ یہ باتیں اتنی دل چسپ ہوتی تھیں کہ اسے پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب صبح ہوئی اور کب رات۔

ایک دن' صبح کو' اس کی کوٹھری کے روشن دان پر دو چڑیاں آکر بیٹھیں۔ اس نے جادو کا موتی زبان کے نیچے رکھا اور ان کی باتیں سننے لگا۔ ایک چڑیا دوسری چڑیا سے کہہ رہی تھی "اس ملک کا بادشاہ بہت بے وقوف ہے۔ اس کے غلے کے گودام سے روز' رات کو' چور چاولوں کی بوریاں چرا کر لے جاتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو چند دنوں میں سارا گودام خالی ہوجائے گا۔"

ڈاڑانگ نے جیلر کو بلایا اور اسے یہ بات بتائی۔ جیلر کو اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے کہا "تم کوئی جادوگر ہو کہ تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے چوری کی خبر مل گئی؟"

ڈاڑانگ بولا "اگر میری بات غلط ہو تو مجھے پھانسی دے دی جائے۔"

جیلر نے کوتوال سے بات کی' کوتوال نے وزیر کو اطلاع دی' اور وزیر نے یہ بات بادشاہ کو کہہ سنائی۔ بادشاہ کے کان کھڑے ہوئے۔ اسی رات بادشاہ کے سپاہیوں نے گودام پر چھاپا مارا اور چوروں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ گودام کے چوکی دار چوروں سے ملے ہوئے تھے۔ وہ بھی پکڑے گئے۔

بادشاہ نے خوش ہوکر' وزیر کو 100 اشرفیاں دیں۔ وزیر نے خوش ہوکر' کوتوال کو 10 اشرفیاں دیں۔ کوتوال نے' خوش ہوکر' جیلر کو ایک اشرفی دی۔ ڈاڑانگ کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔

چند دن بعد ڈاڑانگ نے دیکھا کہ اس کی کوٹھری کی چیونٹیاں باہر بھاگ رہی ہیں۔ ایک چیونٹی کہہ رہی تھی "چلو' چلو' کسی اونچی جگہ چلو۔ پہاڑوں پر موسلا دھار بارشیں ہو رہی ہیں۔ دریا لبالب بھر گئے ہیں۔ سیلاب آنے والا ہے۔ تمام گاؤں' کھیت اور کھلیان بہہ جائیں گے۔"

ڈاڑانگ نے یہ بات جیلر کو بتائی۔ جیلر نے کوتوال کو بتائی' کوتوال نے وزیر سے کہا اور وزیر نے بادشاہ کو بتایا۔

بادشاہ نے اسی وقت گاؤں گاؤں ہرکارے بھیج کر لوگوں کو خبردار کردیا۔ لوگوں نے، جلدی جلدی، دریاؤں کے کنارے اونچے کئے اور کنکر پتھر ڈال کر پشتوں کو مضبوط کردیا۔ اور اس طرح سیلاب کا پانی بغیر کوئی نقصان پہنچائے، گزر گیا۔

بادشاہ نے وزیر سے پوچھا کہ تمہیں غیب کی یہ باتیں کون بتاتا ہے؟ وزیر نے کہا "کوتوال۔" کوتوال بولا "جیلر" اور جیلر بولا "ڈاٹرانگ، جو میری جیل میں قید ہے۔" بادشاہ نے اسی وقت ڈاٹرانگ کو بلایا اور اس سے دریافت کیا کہ تمہیں غیب کی باتیں کیسے معلوم ہوتی ہیں؟ ڈاٹرانگ نے سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا، یہ آدمی تو بڑے کام کا ہے۔ ہمیں آنے والے خطروں سے آگاہ کرتا رہے گا۔ اس نے ڈاٹرانگ کو اپنا وزیر بنالیا اور شاہی محل میں اس کے رہنے کا انتظام کردیا۔ بادشاہ سلطنت کے کام کاج سے فارغ ہوتا تو ڈاٹرانگ کو لے کر کسی باغ یا جنگل میں چلا جاتا اور ڈاٹرانگ اسے مختلف جانوروں کی باتیں سناتا۔ بادشاہ بہت خوش ہوتا اور اسے خوب انعام واکرام دیتا۔

ڈاٹرانگ عیش و آرام میں ایسا مست ہوا کہ اپنے گاؤں کے ان لوگوں کو بھی بھول گیا جو اڑے وقتوں میں اس کی مدد کرتے تھے۔ وہ موتی والے اس سانپ کی یہ نصیحت بھول گیا کہ اپنے اس علم کو نیک کاموں میں صرف کرنا۔ اس کے پاس اتنی دولت جمع ہوگئی تھی کہ وہ چاہتا تو غریبوں کے لئے لنگر خانے، مسافرخانے، یتیم خانے اور اسکول کھول سکتا تھا، یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے لگاسکتا تھا، اور غریبوں کی بیٹیوں کے بیاہ کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا کوئی کام نہ کیا۔ اپنی ہی کھال میں مست رہا۔

ایک دن بادشاہ نے دریا کی سیر کا ارادہ کیا۔ فوراً شاہی کشتی تیار کی گئی، اور جب بادشاہ اس میں سوار ہوگیا تو تین درجن غلاموں نے اسے کھینا شروع کردیا۔ پانی میں رنگ برنگ مچھلیاں تیر رہی تھیں، اور ڈاٹرانگ ان کی دل چسپ باتیں بادشاہ کو سنا رہا تھا۔ اچانک ایک مچھلی نے کوئی ایسی بات کہی کہ جسے سن کر ڈاٹرانگ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس وقت وہ مچھلیوں کی باتیں سننے کے لئے نیچے جھکا ہوا تھا۔ اس کا منہ کھلا تو موتی زبان کے نیچے سے نکل کر پانی میں گر پڑا! بادشاہ نے غوطہ خوروں کو حکم دیا کہ وہ پانی میں سے موتی نکال کرلائیں۔ غوطہ خوروں نے تمام دریا کھنگال ڈالا، موتی کا کہیں پتا نہ چلا۔

بادشاہ کچھ دن تو اداس رہا۔ پھر اس نے اپنی تفریح کا دوسرا سامان کرلیا اور ڈاٹرانگ کو محل سے نکال دیا۔ بادشاہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ڈاٹرانگ رنجیدہ، غم زدہ، دریا کے کنارے بیٹھ گیا اور ریت میں موتی تلاش کرنے لگا۔ وہ ہاتھوں میں ریت بھرتا اور پھر اسے ہوا میں اڑاتا۔ اسے امید تھی کہ اس کا کھویا ہوا موتی اسے مل جائے گا۔ لیکن بے سود۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ اس کی کمر جھکتے جھکتے کبڑی ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ اب اس سے کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ وہ کیکڑا بن گیا تھا!

آپ کو کبھی جنوبی چین کے ساحلوں پر جانے کا اتفاق ہو تو آپ کو وہاں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کیکڑے اپنے پنجوں سے ریت کھودتے اور اس میں کچھ تلاش کرتے نظر آئیں گے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاٹرانگ کی اولاد ہیں، اور اس موتی کو تلاش کررہے ہیں جو سینکڑوں سال پہلے دریا میں گرگیا تھا۔ (سعید لخت)

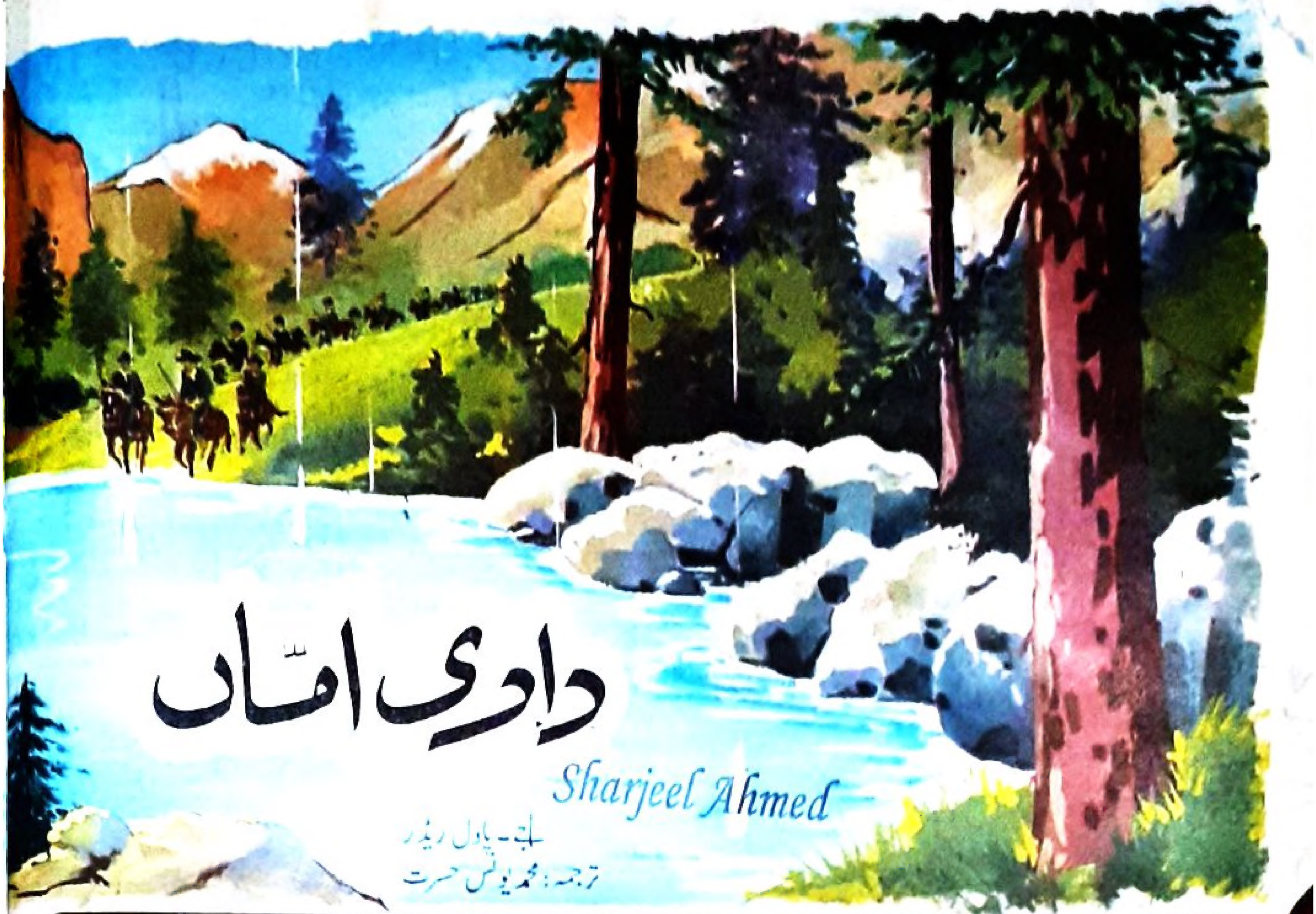

دادی اماں

اب - پاول ریڈر
ترجمہ: محمد یونس حسرت

ریڈ انڈین کون ہیں؟

ریڈ انڈین امریکا کے اصل باشندے ہیں۔ بھورے رنگ اور سیاہ بالوں والے یہ لوگ، ہزاروں سال پہلے، براعظم ایشیا سے امریکا گئے تھے، اور انہوں نے وہاں اپنی بستیاں بسائی تھیں۔ اس وقت اس ملک میں کوئی انسان نہیں رہتا تھا۔ بس چاروں طرف جنگل، بیابان، پہاڑ، جھیلیں اور ندی نالے تھے، جس میں قسم قسم کے جانور پائے جاتے تھے۔

ریڈ انڈین بہت محنتی اور بہادر تھے۔ یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے، جنگلی جانوروں کا شکار کرتے، ان کا گوشت کھاتے اور ان کی کھال سے خیمے اور لباس بناتے تھے۔ اس وقت دنیا والوں کو بالکل پتا نہ تھا کہ اس زمین پر امریکا کا کوئی ملک بھی ہے۔ آج سے پانچ سو سال پہلے اٹلی کا ایک ملاح، کولمبس، وہاں پہنچا تو اس وقت وہاں ریڈ انڈینوں کے کئی قبیلے آباد تھے اور ان لوگوں کی تعداد دو کروڑ سے زیادہ تھی۔

کولمبس اصل میں ہندوستان جانے کے لئے سمندری راستے کی تلاش میں تھا۔ وہ جب امریکا پہنچا تو سمجھا کہ ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ چناں چہ اس نے یہاں کے باشندوں کو انڈین (ہندوستانی) کہا۔ بعد میں انہیں ہندوستانیوں سے الگ کرنے کے لئے ریڈ انڈین (سرخ ہندوستانی) کہا جانے لگا۔

کولمبس نے واپس آکر یورپ کے لوگوں کو اس نئی دنیا کے بارے میں بتایا تو انگلستان، فرانس، اسپین اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے لوگ وہاں جاجا کر آباد ہونے لگے۔ یورپ کے یہ لوگ ریڈ انڈینوں کے مقابلے میں بہت ترقی یافتہ تھے۔ انہوں نے نئی نئی مشینیں بنالی تھیں اور ان کے پاس توپیں، بندوقیں اور پستول تھے۔ ریڈ انڈین بے چارے صرف تیر کمان، کلہاڑیاں اور بھالے استعمال کرتے تھے جو پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔

یورپ سے آئے ہوئے گورے لوگوں نے آہستہ آہستہ ریڈ انڈینوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔ ریڈ انڈین ان کا کئی سال تک مقابلہ کرتے رہے، اور ان جنگوں میں ان کے لاکھوں لوگ مارے گئے۔ آخر بچے کھچے ریڈ انڈین جنگلوں اور بنجر علاقوں میں چلے گئے اور گورے لوگوں نے ان کی تمام زرخیز زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ اب امریکا میں ریڈ انڈینوں کی تعداد چند لاکھ ہے اور وہ امریکا کے سب سے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگ ہیں۔

یہ کہانی اسی دور کی ہے، جب یورپ کے لوگ ریڈ انڈینوں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے لئے ان کا صفایا کررہے تھے، اور ریڈ انڈین جان بچانے کے لئے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

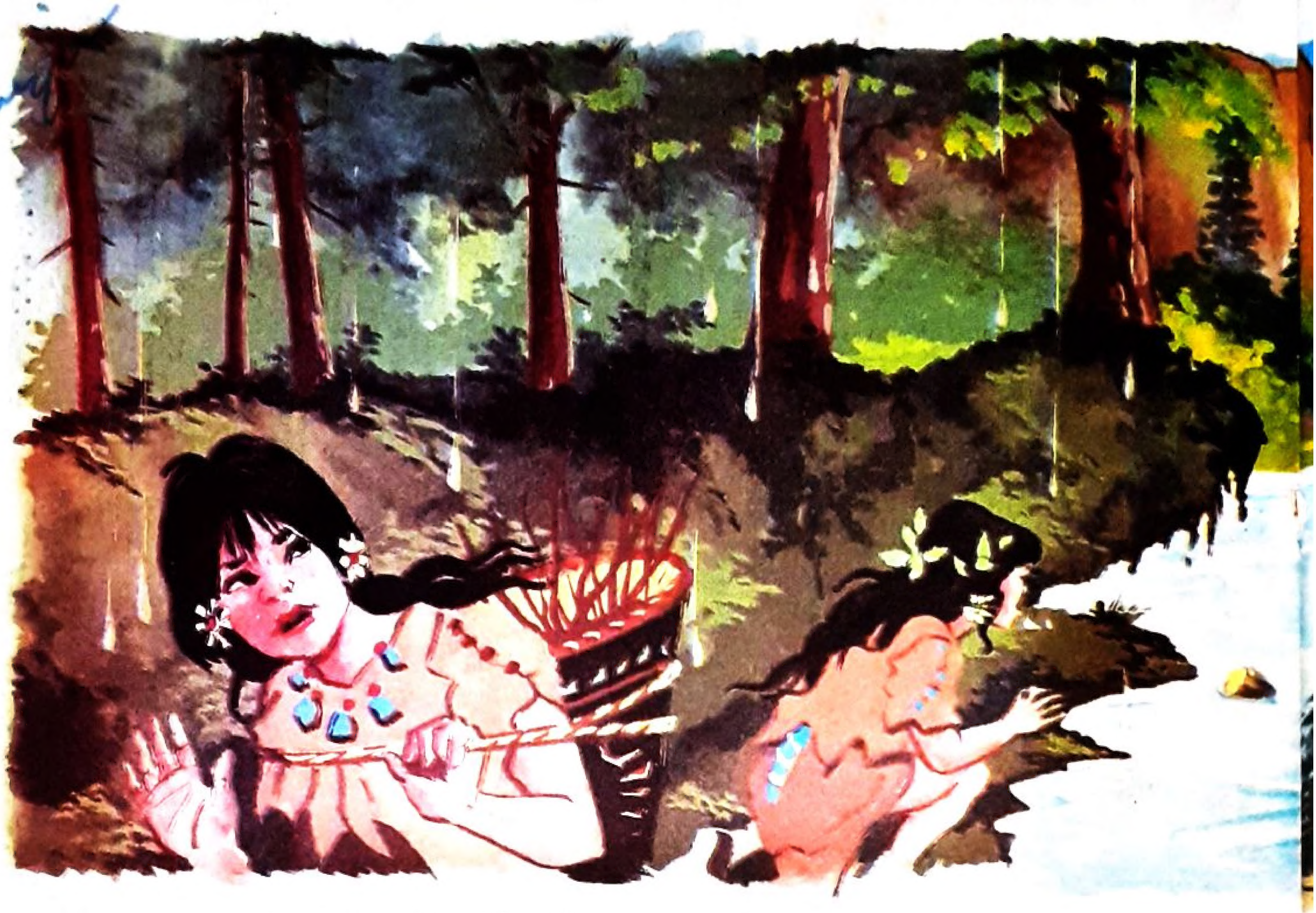

میں اور میری بڑی بہن تابوس میلوں چل چکے تھے۔ مگر دادی امّاں کی ٹوکریوں کی بُنائی کے لئے مُٹھی بھر جنگلی گھاس بھی جمع نہ کر سکے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وادی میں جنگلی گھاس کی کوئی کمی تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ دادی اماں جس قسم کی نفیس اور عمدہ ٹوکریاں تیار کرتی تھیں، ان کے لئے جنگلی گھاس کے ایک خاص موٹائی اور لمبائی کے تیلے درکار ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں تلاش کرنے میں ہمیں خاصی محنت اور بھاگ دوڑ کرنی پڑتی تھی۔

ہر دسویں پندرھویں دن ہمیں دادی اماں کی ٹوکریوں کے لئے گھاس کے تیلے لانے ہوتے تھے اور ہم دونوں بہنیں انہیں تلاش کرتی ہوئی دور دور تک نکل جاتی تھیں۔ ساری وادی کا علاقہ ہمارا دیکھا بھالا تھا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس وادی میں پہاڑیاں کہاں ہیں اور گھاٹیاں کہاں، ندی نالے کہاں ہیں اور درخت اور جھاڑیاں کہاں ہیں۔ جنگلی گھاس کہاں زیادہ پائی جاتی ہے اور کہاں کم۔ اس لئے ہم دونوں جب بھی گھاس کے تیلے جمع کرنے نکلتے تھے، کچھ نہ کچھ لے کر ہی لوٹتے تھے۔

مگر اس روز میں اور میری بڑی بہن تابوس میلوں چل چکے تھے مگر جنگلی گھاس کے مٹھی بھر تیلے بھی جمع نہ کر سکے تھے۔ مجھے اس کا سخت افسوس تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ اور محنت کے باوجود ہم دونوں بہنیں تقریباً خالی ہاتھ تھیں اور مجھے دادی اماں کے سامنے خالی ہاتھ جانا کسی صورت بھی گوارا نہ تھا۔

میری ماں میری پیدائش کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی اور مجھے دادی اماں ہی نے پالا پوسا تھا۔ انہوں نے مجھے اور تابوس کو اپنی محبتوں اور شفقتوں کے سائے میں پروان چڑھانے کے علاوہ ہمیں بہت سی باتیں بتائی تھیں اور بہت سے کام سکھائے تھے۔ انہوں نے ہمیں خشک گھاس کی جڑوں اور تیلوں کو ٹوکریاں بننے کے لئے نرم کرنا اور ان کو خاص قسم کے پودوں اور مٹی سے رنگنا سکھایا تھا۔ انہوں نے ہمیں ہرن کی ٹانگ کی ہڈی سے سوا بنانے اور پھر اس کے ذریعے ٹوکریوں کو سینے کا طریقہ سکھایا

تھا۔ مگر یہ سب کچھ سیکھنے کے بعد بھی میں دادی اماں جیسی نفیس اور خوب صورت ٹوکریاں تیار نہیں کر سکتی تھی۔ بھلا میں، کل کی لڑکی، دادی اماں جیسی مہارت کی مالک کیسے ہو سکتی تھی جو زندگی کی تقریباً 70 بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ اس عمر کو پہنچ کر اگرچہ وہ خاصی کم زور ہو گئی تھیں اور ان کے ہاتھ کانپنے لگے تھے، مگر اس کے باوجود ہمارے یوسا قبیلے میں دادی اماں کی بنائی ہوئی ٹوکریوں کا جواب نہ تھا۔

دادی اماں نے مجھے یوسا قبیلے کے تمام رسم و رواج بتائے تھے۔ انھوں نے مجھے وہ گیت سنائے تھے جو اس قبیلے میں شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر گائے جاتے تھے۔ انھوں نے مجھے قبیلے کے مذہبی عقیدوں کی بابت بھی بتایا تھا اور قبیلے کی تاریخی روایات کے بارے میں بھی کئی کہانیاں سنائی تھیں۔ دادی اماں کی سنائی ہوئی ان باتوں کے نتیجے میں میرے دل میں اپنے قبیلہ یوسا کے بارے میں ایک فخر کا احساس پیدا ہو گیا تھا ---- مگر ان سب باتوں سے کہیں بڑھ کر دادی اماں نے ہمیں پیار دیا تھا۔ ان کا یہ پیار ہی ہماری زندگی تھا اور انھی کے پیار کی بدولت ہماری زندگی میں رونق تھی۔ اسی لئے ہمیں دکھ ہو رہا تھا کہ ہم ان کے لئے جنگلی گھاس کے مٹھی بھر تیلے بھی جمع نہ کر سکے تھے۔

ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تو میں نے اور تابوس نے جنگلی گھاس کی تلاش ترک کر دی اور واپس جانے کی ٹھانی۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی۔ ہم نے اس ندی کو پار کیا ہی تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے رک کر تابوس کا بازو تھام لیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ تابوس کے قدم وہیں رک گئے اور پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں کیوں کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔

یہ گوری چمڑی والے لوگ تھے جو گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ وادی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ کم از کم 50 تھے اور انھیں دیکھتے ہی ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ہماری بستی کی تلاش میں ہیں۔

وادی میں تو برف پگھل چکی تھی مگر اوپر پہاڑیاں ابھی تک جمی ہوئی برف کا سفید لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ اگر ہم بستی والوں کو وقت پر خبردار کرنے میں کام یاب ہو گئے تو وہ پہاڑیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو بچالیں گے اور گوری چمڑے والے پہاڑیوں میں جانے کی بجائے خالی بستی میں لوٹ مار کر کے واپس چلے جائیں گے۔

"جلدی کرو، تنانہ!" میری بہن تابوس نے سرگوشی کی "جلدی سے درختوں کی اوٹ میں ہو جاؤ!"

ہم دونوں جلدی سے درختوں کی اوٹ میں ہو گئے تاکہ گورے گھڑسوار ہمیں نہ دیکھ سکیں۔ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے جب ہم ان سے کافی فاصلے پر آ گئے تو ہم نے بستی کی طرف دوڑ لگا دی۔ پہاڑی راستہ ناہموار اور اونچا نیچا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں جن کے کانٹے ہماری ٹانگوں، بازوؤں اور چہروں کو زخمی کر رہے تھے۔ پھر بارش کی وجہ سے پھسلن بھی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود ہم سر پر پاؤں رکھ کر گاؤں کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

میرا قد چھوٹا اور جسم کسی قدر بھاری تھا، جب کہ میری بہن تابوس لمبی اور دبلی پتلی تھی۔ اس لئے میں اس کی طرح تیز نہیں دوڑ سکتی تھی۔ وہ بار بار مجھے اور تیز دوڑنے کو کہتی لیکن میرا حال یہ تھا کہ تیز دوڑنے کی وجہ سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ تابوس کو میری خاطر بار بار رکنا اور کبھی کبھی مجھے گھسیٹ کر آگے بڑھانا پڑتا تھا۔

پھر اچانک ایک جگہ تابوس کے قدم ایک دم رک گئے اور میں اس سے ٹکرا کر دھم سے زمین پر گر پڑی۔ قریب تھا کہ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی کہ تابوس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کی تاکید کی اور پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے سامنے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے درختوں کی طرف نگاہ کی اور کچھ دیر بعد اس گورے گھڑسوار کو دیکھ پائی جسے تابوس نے مجھ سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی چمک دار نیلی آنکھوں سے اردگرد کا

جائزہ لے رہا تھا تاکہ اسے ہمارے قبیلے کا ٹھکانا معلوم ہوسکے۔ اس کی نظریں اگرچہ اسی طرف تھیں جہاں ہم دونوں بہنیں چھپی ہوئی تھیں مگر جھاڑیوں میں ہونے کی وجہ سے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکا تھا۔

اب ہم نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ پھر جھاڑیوں میں سے نکلے اور بستی کی طرف بھاگے تاکہ جلد سے جلد بستی میں پہنچ کر قبیلے والوں کو خبردار کردیں۔ خوف کی وجہ سے ہمیں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہمیں بھاگتے بھاگتے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔

درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان دوڑتے ہوئے مجھے وہ تمام باتیں یاد آرہی تھیں جو دادی اماں نے گورے لوگوں کے بارے میں بتائی تھیں۔ انہوں نے اس خوف ناک وبا کی کتنی ہی کہانیاں سنائی تھیں جو گورے سپاہی اور سونے کی تلاش میں آنے والے گورے لوگ اس وادی میں لے کر آئے تھے۔ صرف اٹھارہ سال پہلے ہی یسوما قبیلے کی ایک تہائی آبادی اس وبا کا شکار ہوکر موت کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

دادی اماں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے باپ دادا امن پسند لوگ تھے۔ اس وادی کی زمینیں صدیوں سے ان کی تھیں۔ پھر یہ گوری چمڑی والے آگئے۔ انہوں نے ہماری خوب صورت وادی میں جگہ جگہ گڑھے کھودے، درختوں کو کاٹا اور ان جانوروں کو بے دردی سے ہلاک کیا جن کے گوشت سے ہم اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ اور پھر وہ ہمارے قبیلے کے لوگوں کو بھی ہلاک کرنے لگے۔ گوری چمڑی والوں کی ان زیادتیوں کے جواب میں ہمارے قبیلے کے بہادر جوان چھپ چھپ کر ان پر حملے کرتے تھے، اس لئے گورے شکاری کتوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

دوڑتے دوڑتے ہماری سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ آخر جب بستی دکھائی دی تو ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ شاید ہمیں زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ شاید ابھی وقت تھا کہ بستی والے خطرے سے خبردار ہوکر اپنے بچاؤ کا کوئی بندوبست کرسکیں۔

"بابا! بابا!" میں زور سے چیخی۔

"بابا! اوہ، بابا!" تابوس نے چلا کر کہا۔

ہمارا باپ اس وقت جھونپڑی کے ایک کونے میں بیٹھا نئے تیر تیار کررہا تھا۔ ہماری چیخیں سن کر وہ جلدی سے ہماری طرف آیا اور ہم دونوں کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

ہم دونوں بہنیں پہلے تو خاموش رہیں، پھر ایک ساتھ بولنے لگیں اور گورے لوگوں کے آنے کی بات بتانے لگیں۔

"وہ آرہے ہیں، بابا" تابوس کہنے لگی "ہوسکتا ہے وہ بستی کے قریب آگئے ہوں۔"

ہمارے باپ نے اطمینان سے ہماری بات سنی اور پھر کہنے لگا "تم نے بہت اچھا کیا جو آکر بتادیا۔ ہمیں اپنا بچاؤ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت مل جائے گا۔ ہمیں ابھی اس بستی سے جانا ہوگا"۔

میرا باپ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پھر وہ ایک جھونپڑی سے دوسری جھونپڑی اور دوسری جھونپڑی سے تیسری کا چکر کاٹتے ہوئے قبیلے والوں سے کہنے لگا کہ جلدی سے ضروری سامان اور خوراک لے کر بستی سے نکل جائیں۔

دادی اماں نے ایک بار بہت پہلے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ شاید کبھی ہم لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لئے اس وادی کو چھوڑ کر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر جانا پڑے۔ ان پہاڑیوں کی چڑھائی بہت مشکل تھی، مگر ان کے علاوہ چھپنے کی کوئی اور جگہ بھی نہ تھی۔

اب وہ وقت آگیا تھا جس کی بات دادی اماں نے کی تھی۔ وہ چھوٹا موٹا سامان باندھتے ہوئے ہمیں یہ کرو، وہ کرو، فلاں چیز لاؤ، وہ چیز اٹھاؤ، کے حکم دے رہی تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے حرکت کررہے تھے اور ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی بالکل نہیں تھی۔

ہمارے باپ نے بستی والوں کو خبردار کردیا تھا۔ اردگرد کے قبیلوں میں گوری چمڑی والوں کے ہاتھوں ریڈ انڈینوں کی بستیوں کے جلنے اور تباہ ہونے کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں اور ہمارے قبیلے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی روز ان کی بستی کی باری بھی آسکتی ہے۔ چناں چہ ذرا سی دیر میں ساری بستی کے لوگ اپنا سامان باندھ کر تیار ہوچکے تھے۔

ہم دونوں بہنیں دادی اماں کی طرف بڑھیں تاکہ ان سے وہ گٹھڑیاں لے لیں جو انہوں نے ہمارے لئے تیار کی تھیں۔ دادی اماں نے ایک ایک گٹھڑی ہماری پیٹھوں سے باندھ دی۔ ان میں کمبل کے علاوہ گرم کپڑوں کے دو دو جوڑے، جوتوں کا ایک ایک جوڑا اور کچھ کھانے پینے کا سامان تھا۔ اس کے بعد وہ بڑے آرام اور اطمینان سے چولھے کے پاس بیٹھ گئیں۔

"چلو، دادی اماں، جلدی چلو" میں نے کہا "وقت بہت کم ہے۔"

"ہاں، میری بچی" دادی اماں نے جواب دیا "وقت بہت کم ہے لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، دادی اماں؟" میں نے حیرانی سے کہا "سب لوگ جارہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں جائیں گی؟"

"نہیں، تنانہ" دادی اماں نے کہا "تم جانتی ہو، میری بوڑھی ہڈیوں میں پہاڑی پر چڑھنے کی سکت نہیں ہے۔ تم جاؤ۔ میں یہیں اپنے گھر میں رہوں گی۔"

"ایسا نہ کہیں دادی اماں، ایسا نہ کہیں" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے "آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔"

"اپنے آنسو پونچھ لو، میری بچی" دادی اماں نے کہا "تم خاصی عمر کی ہوگئی ہو اب۔ تمہیں حوصلے سے حالات کا سامنا کرنا چاہئے۔ تم یسوما قبیلے کے رسم ورواج سے اچھی طرح واقف ہو، اور ہمارے قبیلے کا دستور یہی ہے کہ ایسے موقعوں پر بوڑھے لوگ جوانوں کے ساتھ نہیں جاتے۔ انہیں بستی ہی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تم جاؤ۔ میں یہیں رہوں گی۔"

میں نے آگے بڑھ کر دادی اماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "دادی اماں، مجھے آپ سے بڑا پیار ہے۔"

"مجھے بھی تم سے بڑا پیار ہے، تنانہ" دادی اماں نے بڑے سکون سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "مگر تم ان بوڑھی ہڈیوں کو یہیں رہنے دو اور خود چلی جاؤ۔ شاباش!"

"لیکن کیوں؟ آخر کیوں دادی اماں؟" میں نے چیخ کر کہا "آپ ہمارے ساتھ جانے کی بجائے یہاں رہنے پر ضد کیوں کررہی ہیں؟ آپ کو اس خطرے کا خیال نہیں جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے؟ وہ گورے لوگ یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ ساری بستی کو آگ لگادیں گے، تباہ کردیں گے۔ آپ کو ---- آپ کو بھی مارڈالیں گے۔"

دادی اماں میری بات سن کر چند لمحے خاموش رہیں اور پھر کہنے لگیں "سنو، تنانہ! مجھے اس خطرے کا تم سے کہیں زیادہ احساس ہے جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ مگر ایسے خطرے کے وقت بڑھاپا جوانی کے پیروں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اسی لئے یسوما قبیلے کا دستور ہے کہ جب جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑے تو جو بھاگ سکتے ہوں، وہ بھاگ جائیں، اور جو بھاگ نہیں سکتے، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ قبیلے کے قانون کو ماننے ہی میں قبیلے والوں کی بھلائی ہے۔ میں اپنے فائدے کو قبیلے کے فائدے پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ تم لوگوں کے ساتھ جاکر تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بن سکتی -- میں یہیں رہوں گی -- کیا تم نہیں جانتیں کہ قبیلے کی طرف سے تم پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟"

"میں جانتی ہوں، دادی اماں" میں نے جواب دیا۔ مگر میرا گلا رندھ گیا تھا اور آنسو تھے کہ برابر میرے گالوں پر بہے جارہے تھے۔ میں یسوما قبیلے کے اس دستور اور قانون

سے اچھی طرح آگاہ تھی کہ جب قبیلے والے گوروں کے خوف سے ایک جگہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جاتے ہیں تو بوڑھوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ مگر میں نے یہ کبھی سوچا تک نہ تھا کہ ہمیں ایک دن اپنی جان سے پیاری دادی اماں کو بھی پیچھے چھوڑ کر جانا ہوگا!

"تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہئے' میری بچی" دادی اماں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جاؤ میرے نام کو بٹا نہ لگاؤ۔"

میں نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے دادی اماں کے چہرے کی طرف دیکھا ----- ان کی آنکھوں میں خوف کی بجائے اطمینان تھا' سکون تھا اور میرے لئے پیار ہی پیار تھا۔ میں نہ جانے کب تک ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہتی کہ انہوں نے میرا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "بس' اب جاؤ میری بچی۔ دیر ہو رہی ہے۔ وقت بہت کم ہے۔"

"میں کبھی آپ کے نام کو بٹا نہیں لگاؤں گی' دادی اماں" میں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "مجھے اپنے فرض کا احساس ہے' اور میں یہ فرض ادا کرنے کی پوری کوشش کروں گی--- آپ نے مجھے زندگی کا جو سبق دیا ہے' وہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے میں ایک بار پھر بے اختیار دادی اماں سے لپٹ گئی۔ دادی اماں نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر پیار کیا' اور اس وقت مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے اپنی ساری بہادری اور حوصلہ مندی میرے سینے میں انڈیل دی ہے۔

میں ان کے سینے سے الگ ہوئی اور پھر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

تابوس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا "دادی اماں کہاں ہیں؟"

"انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے" میں نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے گلے میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر تابوس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اداس اداس تھیں مگر یہ اداس اداس آنکھیں شاید بات کی تہ تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

میں نے کہا "تابوس' اگر مجھے بھی دادی اماں کی طرح زندگی کی اتنی ساری بہاریں دیکھنی نصیب ہوں تو وقت آنے پر میں بھی یہی چاہوں گی کہ ان کی طرح دلیری' حوصلہ مندی اور بے خوفی دکھا سکوں۔"

"اور میں بھی" تابوس نے آہستہ سے کہا اور پھر ہم خاموشی سے پہاڑی راستے کی طرف چلنے لگے۔

بچوں کے لیے درسِ قرآن

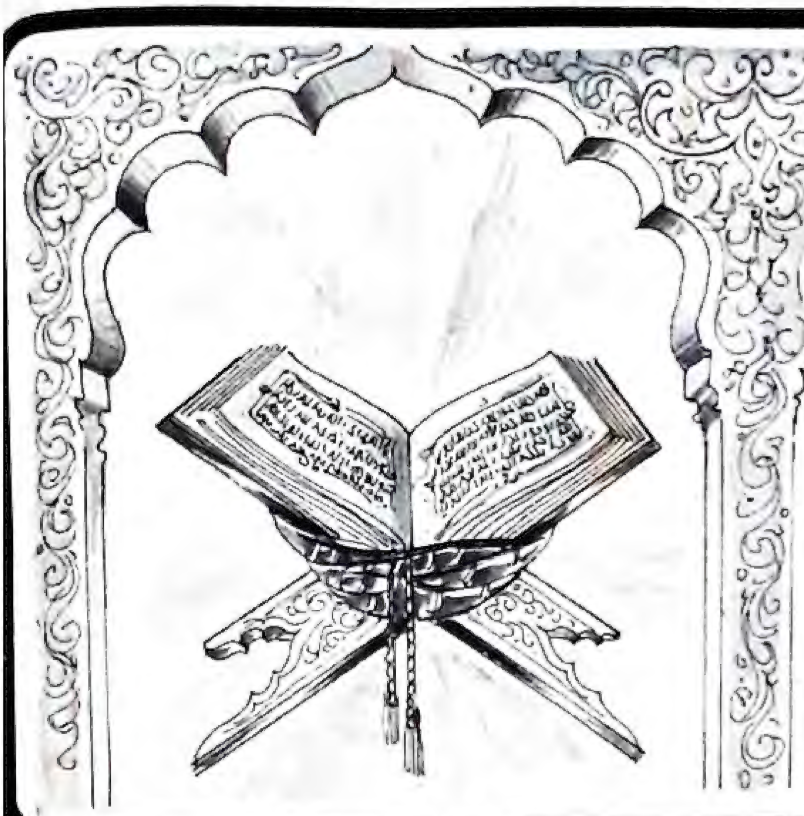

درسِ قرآن

معافی اور اِصلاح کے فائدے

ایک دوسرے کی غلطیاں اور زیادتیاں معاف کردینا بہت بڑی نیکی ہے۔ اپنی اور دوسروں کی اصلاح اور ترقی کے لئے کوشش کرنا بھی بہت بڑی خوبی ہے۔ ان باتوں پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم نے قرآنِ حکیم کی سُورہ الشوریٰ کی چالیسویں آیت کا یہ درمیانی جملہ منتخب کیا ہے:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ؕ

ترجمہ : جو معاف کردیتا ہے اور اِصلاح کرتا ہے اُس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمّے ہوجاتا ہے۔

گھر، گلی محلّے، مدرسے اور کھیل کے میدان میں ہمارے ساتھیوں سے کئی بار کوئی چھوٹی بڑی ایسی بات ضرور ہوجاتی ہے، جو ہمیں ناگوار گزرتی ہے۔ بھلائی اسی میں ہے کہ ہم ایسی ناگوار حرکتیں کرنے والوں کو معاف کردیں۔ معافی کے ایسے فراخ دل رُجحان سے بُری بات آئی گئی ہوجاتی ہے۔ لیکن اگر ہم ہر تلخ بات کا سختی سے نوٹس لیں تو زندگی اجیرن ہوجائے۔ زندگی میں محبت، رفاقت، مسرّت اور خیرسگالی کی فضا تب ہی قائم رہ سکتی ہے جب ہم ایک دوسرے کی خامیوں اور خطاؤں کو بھلا دیا کریں۔

اسی طرح اپنی اصلاح کرنا اور دوسروں کو اصلاح پر آمادہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اگر انسان اپنی اصلاح سے غافل ہوجائے تو وہ رفتہ رفتہ بالکل گنوار بن جاتا ہے۔ اور اگر کہیں معاشرے کی اصلاح کا سلسلہ ڈھیلا پڑجائے تو تعمیر وترقی کے تمام دروازے بند ہوجاتے ہیں۔

معافی اور اصلاح کی خوبیوں کی کوئی حد نہیں۔ افراد اور سارے معاشرے کی تعمیروترقی اسی قسم کے نیک کاموں کی محتاج ہے۔ اسلام میں ان اوصاف کا بہت بلند درجہ ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اس بات کی یقین دہانی کرائی ہے کہ ایسی نیکیاں کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی رنگ میں کوئی نہ کوئی اجر، معاوضہ، بدلہ، انعام وغیرہ ضرور عطا فرمائیں گے۔

ڈاکٹر عبدالروف

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

تخت و تاج کی قیمت

Sharjeel Ahmed

سنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچو! ایک تھا بادشاہ۔ وہ بڑا مغرور، کنجوس اور ظالم تھا۔ رعایا اس کے مظالم سے نالاں تھی۔ اس کے ملک میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ سرکاری مدرسے تھے نہ کالج۔ لوگوں کے علاج معالجے کے لئے ہسپتال بھی نہ تھے۔ جہالت اور بے روزگاری عام تھی۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی اکثریت غریب اور تنگ دست تھی۔ مختصر یہ کہ رعایا اپنے بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھی، بلکہ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انسانی حقوق ہوتے کیا ہیں۔

ایسے ظالم بادشاہ کو "فرعون" کہتے ہیں۔ وہ خود عالی شان محل میں بڑے کروفر اور عیش و عشرت میں رہتا تھا۔ اس نے رعایا کی اراضی کو اپنے قبضے میں کرکے اپنے فوجی افسروں اور درباریوں میں تقسیم کردیا تھا۔ جاگیردار اپنے آپ کو سردار، مخدوم، نواب اور وڈیرے کہتے تھے۔ وہ بھی اپنی جاگیروں پر رہنے والے مزارعوں اور کھیت مزدوروں پر ظلم کرتے تھے۔ لیکن کسی شخص کو احتجاج یا فریاد کرنے کی اجازت نہ تھی۔

ظالم بادشاہ کے پاس سب کچھ تھا۔ محلات، لعل وجواہر، مال و دولت اور ایک بہت بڑا لشکر۔ لیکن اسے دل کا اطمینان حاصل نہ تھا۔ اس کی سلطنت وسیع، لیکن اس کا دل تنگ تھا۔ سچ ہے، مال و دولت اور زر و جواہر سے دل کی دولت نہیں ملتی۔ دل کی دولت یعنی خوشی لوگوں کو خوشیاں دینے سے ملتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بخیل یعنی کنجوس کے دل میں خوف اور غم کی آگ جلتی رہتی ہے۔

پیارے بچو! کیا آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں بخل کسے کہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کو بخل یا کنجوسی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب ہے، غریب غربا اور ضرورت مندوں کو مالی امداد دینا۔ جو شخص ایسا نہیں کرتا، اسے بخیل یا کنجوس کہتے ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ پھر اسے نیکی اور بدی کی تمیز نہیں رہتی۔ وہ سرکش اور ظالم بن جاتا ہے۔

ظالم بادشاہ کے وزیر اور امیر سب خوشامدی اور لالچی تھے۔ وہ بادشاہ کی جھوٹی تعریفیں کرکے اسے خوش رکھتے تھے۔

ایک دن اس بادشاہ کے دربار میں ایک عالم فاضل بزرگ آیا۔ اس نے بادشاہ کو مخاطب کرکے فرمایا "بادشاہ سلامت! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہت دی ہے اور مال و دولت سے نوازا ہے۔ آپ کا ملک وسیع اور زرخیز ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کی رعایا دانے دانے کو محتاج ہے۔ بیماروں کو دوا میسر نہیں۔ ان کے علاج کے لئے کوئی ہسپتال نہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوئی اسکول نہیں۔ آپ کے جاگیردار اپنے مزارعوں اور مزدوروں کو اپنا محکوم وغلام سمجھتے ہیں اور ان کو حقارت سے "کمی" یعنی کمین کہتے ہیں۔ کمی دن رات محنت کرکے جو اناج اگاتے ہیں ان کا زیادہ حصہ جاگیردار یا بڑے بڑے زمین دار لے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان پر ایسے ایسے ظلم توڑتے ہیں کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

"رب رحمان نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ زمین کی پیداوار میں سب انسانوں کا برابر کا حصہ ہے۔ آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنی رعایا کو اس کا یہ حصہ دلائیں اور انہیں دوسرے انسانی حقوق بھی دیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو قیامت کے روز آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور اس

نافرمانی کا حساب دینا ہوگا۔"

بزرگ کی یہ تقریر سن کر بادشاہ کے خوشامدیوں کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے بادشاہ کو بزرگ کے خلاف اکسایا۔ اس نے بزرگ کو قید کردیا۔

کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کا پیٹ پھول گیا۔ مارے درد کے اس کا برا حال ہوگیا۔ شاہی طبیب جوں جوں علاج کرتے' مرض بڑھتا جاتا۔ دور دراز علاقوں سے ماہر طبیبوں کو بلایا گیا' لیکن ان کے علاج سے بادشاہ کو شفا نہ ہوئی۔ سارے طبیب مایوس ہوگئے۔

قیدی بزرگ کو بادشاہ کی بیماری کا پتا چلا تو اس نے کہلا بھیجا کہ اگر بادشاہ اجازت دے تو وہ اس کا علاج کرے گا اور بادشاہ ان شاء اللہ شفایاب ہو جائے گا۔

بادشاہ نے فوراً اس بزرگ کو قید خانے سے بلایا۔ بزرگ نے بادشاہ کا معائنہ کیا اور کہا "بادشاہ سلامت' میرے علاج سے آپ صحت یاب ہوسکتے ہیں۔ لیکن..."

بادشاہ: لیکن کیا؟

بزرگ: میری ایک شرط ہے۔

بادشاہ' جو درد سے بے کل اور مرنے کے قریب ہو رہا تھا' بولا "جلد کہو۔ تمہاری کیا شرط ہے؟"

بزرگ: میری شرط آپ کا تخت ہے۔ آپ شفایاب ہو جائیں تو بادشاہت مجھے عطا کردیں۔

بادشاہ: میری تمام دولت لے لو اور جلد علاج کرو۔

بزرگ: بادشاہت سے کم پر راضی نہیں ہوں گا۔

بادشاہ' جو درد سے بری طرح تڑپ رہا تھا' بولا "آدھی بادشاہت لے لو"۔

بزرگ: نہیں' پوری بادشاہت لوں گا۔

بادشاہ پر نزع کی حالت طاری ہونے لگی تو وہ مجبور ہوگیا اور تڑپ کر بولا "پوری بادشاہت دیتا ہوں۔ اب علاج کرو۔"

بزرگ نے بادشاہ کو دوا دی تو چند لمحوں بعد بادشاہ کے پیٹ کی ساری ہوا خارج ہوگئی۔ بادشاہ کی جان میں جان آئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے وعدے کے مطابق اس بزرگ سے کہا "آؤ! تخت و تاج سنبھالو! آج سے میری ساری بادشاہت تمہاری ہے۔"

بزرگ نے جواب دیا "بادشاہ سلامت! بادشاہت آپ ہی کو مبارک ہو۔ جس تخت و تاج کی قیمت گندی ہوا ہو' میں اسے قبول نہیں کرسکتا۔"

بادشاہ نے مارے خوشی کے اس بزرگ حکیم کو گلے لگالیا اور کہا "آپ نے ایک تو میری جان بچائی اور دوسرے بادشاہت مجھے واپس کردی۔ میں آپ کے اس عظیم احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میرے وزیراعظم بن کر میرے ساتھ محل میں رہنا قبول فرمائیں اور اپنی مرضی کے مطابق سلطنت کا کاروبار چلائیں۔" بزرگ نے بادشاہ کی یہ درخواست بھی قبول کرنے سے انکار کردیا اور واپس جانے کی اجازت چاہی۔

بادشاہ نے اسے زروجواہر کی تھیلیاں پیش کیں' لیکن اس مرد مجاہد نے ان کو بھی لینے سے انکار کردیا اور بولا "بادشاہ سلامت! میری خوشی اس میں ہے کہ آپ وعدہ فرمائیں کہ میں نے آپ کو جو نصیحت کی تھی' اس پر عمل کریں گے"۔

بادشاہ نے وعدہ کیا اور بزرگ کو بڑے تپاک سے رخصت کیا۔

اب بادشاہ کی کایا پلٹ چکی تھی۔ اس نے اپنے رب رحمان کے حضور اپنے گناہوں سے توبہ کی اور آئندہ اس کے احکام کے مطابق حکومت کرنے کا وعدہ کیا۔

چناں چہ سب سے پہلے اس نے ملک میں سرمایہ داری' جاگیرداری اور سود کا نظام ختم کیا۔ جاگیرداروں اور بڑے زمین داروں کی اراضی مزارعوں اور کاشت کاروں

(باقی صفحہ 29 پر)

مداری

لیوس جونز
ترجمہ: سلیم احمد صدیقی

میں بازار میں دکانوں کے شوکیسوں میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھتا جا رہا تھا کہ ایک بوند ٹپ سے میرے سر پر پڑی۔ اس کے بعد دوسری میرے ہاتھ پر گری۔ میں بارش سے بچنے کے لئے ایک دکان کے اندر گھس گیا۔ یہ پالتو جانوروں کی دکان تھی۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی ایک موٹی تازی خاتون، سرخ لباس پہنے، میری جانب آئی اور مسکرا کر بولی "آؤ، بیٹے۔ کیا چاہئے؟ کوئی جانور یا کوئی پرندہ؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ میں تو دراصل بارش سے بچنے کے لئے دکان کے اندر چلا گیا تھا۔

"میں سمجھ گئی" خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں بھی میری طرح جانوروں اور پرندوں سے پیار ہے اور تم کچھ خریدنے آئے ہو۔"

"مم --- میں ---- میں دراصل بارش سے بچنے کے لئے اندر آگیا تھا" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، بیٹے" خاتون نے اطمینان سے کہا "خریدنا مت۔ مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ ذرا ادھر آؤ۔ یہ بلی دیکھو۔ اس ڈبے میں سوئی ہوئی بالکل شہزادی لگ رہی ہے۔ اور یہ دیکھو، کتے کے تین پلے" وہ دکان کے اندر جا کر تین چھوٹے چھوٹے پلے لے آئی۔ اس نے انہیں زمین پر چھوڑ دیا اور وہ میری ٹانگوں کے بیچ میں اچھلنے کودنے لگے۔

"یہ سارا دن اسی طرح کھیلتے رہتے ہیں۔ اچھے ہیں ناں؟" خاتون نے پوچھا۔

"ج --- جی ہاں ---- اچھے ہیں، مگر میرے پاس خریدنے کے لئے پیسے ----" میں نے رک رک کر کہا۔

"کوئی بات نہیں، بیٹے" خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا "اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ ہم باتیں کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں پرندے اچھے لگتے ہیں۔"

میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "جی ہاں، اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے پاس پرندے بھی ہیں؟"

خاتون کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی "ادھر آؤ، اس طرف۔" وہ مجھے دکان کے پچھلے حصے میں لے گئی "یہاں ہیں پرندے" اس نے کہا۔ وہاں واقعی بہت سارے پرندے تھے۔ میری نظر طوطوں پر ٹک گئی۔

"یہ طوطے بولتے بھی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بولتے ہیں" خاتون نے جواب دیا۔

"بولتا ہوا طوطا کتنے کا ہے؟ میرے پاس ایک پونڈ ہے" میں نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے، بیٹے۔ایک پونڈ میں میں نہیں دے سکتی۔ بولتا ہوا طوطا دو پونڈ کا ہے۔" خاتون نے کہا۔

اب بارش رک گئی تھی۔ میں خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن بازار میں ایک جگہ مجمع لگا دیکھ کر رک گیا۔ کوئی مداری اپنے سامنے میز لگائے کھڑا تھا۔ میز پر تین پیالیاں الٹی رکھی ہوئی تھیں اور مداری زور زور سے کہہ رہا تھا "دیکھئے، دیکھئے، صاحبان، مہربان، قدر دان۔ یہ تین پیالیاں ہیں اور تینوں خالی ہیں۔ آپ خود آگے آکر انہیں دیکھ لیں اور تسلی کر لیں کہ یہ خالی ہیں۔ ان کے نیچے کوئی چیز نہیں ہے۔"

کئی لوگ مجمع میں سے آگے بڑھے اور پیالیوں کو اٹھا کر دیکھا۔ سب خالی تھیں۔

"دیکھئے، جناب۔ یہ میں نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے ایک سبز گیند نکالی ہے اور اسے بیچ والی پیالی کے نیچے رکھنے لگا ہوں۔ یہ لیجئے" اس نے بیچ والی پیالی اٹھا کر اس کے نیچے گیند رکھ دی۔

"اب بتائیے، صاحبان۔ کون سی پیالی کے نیچے گیند ہے؟ ٹھیک۔ درمیان والی پیالی کے نیچے ہے۔ اب کھیل شروع ہونے لگا ہے۔ میں پیالیوں کی جگہ بدلوں گا اور آپ میرے ہاتھوں اور پیالیوں کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جو شخص کسی پیالی پر ایک پونڈ کا نوٹ رکھے گا اور اس کے نیچے سے گیند نکل آئے گی تو اسے دو پونڈ ملیں گے۔ اگر نہ نکلی تو اس کا پونڈ میرا ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر مداری نے پیالیوں کی جگہ بدل دی۔ میں جانتا تھا کہ اب گیند کون سی پیالی کے نیچے ہے۔ لیکن بعد میں اس نے ذرا تیزی دکھائی اور میری نظر چوک گئی۔ ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے ایک پونڈ کا نوٹ دائیں پیالی پر رکھ دیا۔

"دیکھتے ہیں، بھائی جان، مہربان، قدر دان" مداری نے یہ کہتے ہوئے پیالی اٹھائی۔ مگر اس کے نیچے کچھ نہ تھا۔ اس نے بائیں طرف والی پیالی اٹھائی تو اس کے نیچے گیند تھی۔ "کوئی بات نہیں۔ پھر قسمت آزمائیے، بھائی جان"

مداری نے نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا اور پھر سے گیند اور پیالیوں کا کرتب دکھانے لگا۔

اس نے کئی بار یہ کرتب دکھایا اور ہر بار ایک ایک پونڈ کے نوٹ اس کی جیب میں چلے گئے۔ ایک بار تو میرے جی میں بھی آئی کہ میں بھی اپنا نوٹ ایک پیالی پر رکھ دوں، مگر میں نے سوچا کہ جب اتنے بڑی عمر کے لوگوں کا اندازہ غلط ہو رہا ہے تو میرا اندازہ کیا خاک ٹھیک ہوگا۔

"لیجئے، صاحبان۔ اب آخری بار" مداری نے کہا اور پھر وہی کھیل دکھانے لگا۔ ایک اور صاحب ایک پونڈ کا نوٹ لہراتے ہوئے آگے بڑھے اور انہوں نے وہ نوٹ درمیان والی پیالی پر رکھ دیا۔ مداری نے درمیان والی پیالی اٹھائی تو اس کے نیچے گیند نہ تھی۔ "اچھا، صاحبان، مہربان، قدردان۔ آج کا کھیل ختم۔ لیکن ایک جادو آپ کو دکھا

دوں۔ آپ خوش ہو کر گھر جائیں گے۔" یہ کہ کر اس نے دائیں پیالی بھی اٹھا دی۔ گیند اس کے نیچے بھی نہ تھی۔ اس کے بعد اس نے بائیں پیالی پر ہاتھ رکھا اور زور سے پوچھا "اس کے نیچے کیا ہے، بھائی جان؟" سب لوگ بولے "سبز گیند۔"

"نہیں، صاحبان" یہ کہ کر اس نے پیالی اٹھائی تو اس کے نیچے سے ایک طوطا نکلا۔

"آپ یہ طوطا بیچیں گے؟" جب لوگ چلے گئے تو میں نے مداری سے پوچھا۔

"ہاں تم خریدو گے؟" اس نے پوچھا۔

"کتنے کا ہے؟ میرے پاس تو ایک پونڈ ہے" میں نے کہا۔

"یہ اتنے ہی کا ہے۔ لے لو" اس نے طوطا میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے نوٹ اسے دیتے ہوئے پوچھا "یہ بولتا ہے ناں؟"

"ہاں جو سنے گا، وہی بولے گا" مداری نے کہا۔

میں طوطے کو لے کر خوشی خوشی گھر پہنچا اور اس سے کہا "میاں مٹھو۔"

"ٹیں ٹیں" طوطا جواب میں ٹیں ٹیں کرنے لگا۔

"میاں مٹھو چوری کھاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ٹیں ٹیں، ٹیں" طوطے نے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ مداری نے مجھے الو بنایا ہے۔ اب میں اس طوطے کا کیا کروں؟ کیوں نہ اسے بیچ دوں۔ یہ سوچ کر میں اسی جانوروں والی دکان پر پہنچا جہاں تھوڑی دیر پہلے بارش سے پناہ لینے کے لئے رکا تھا۔ سرخ لباس والی موٹی سی خاتون نے میری بات غور سے سنی اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"بیٹے، ہم تو بیچتے ہیں، خریدتے نہیں۔ مداری نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ میرا بھائی لاری اس مداری کو جانتا ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ۔ شاید وہ مداری سے تمہاری رقم واپس دلوا دے" خاتون بولی۔

میں نے خاتون سے اس کے بھائی کا پتا پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور اس کی دکان ہے اور دکان کا نام ہے "ننھے عجائبات"۔ دس بارہ منٹ بعد میں "ننھے عجائبات" نامی دکان میں کھڑا تھا۔ اس دکان میں واقعی بہت سارے ننھے ننھے عجائبات تھے۔ لمبی لمبی اور نارنجی پلاسٹک کی ناکیں، چڑیلوں اور ڈریکولا کے چہرے، ماچس کی ڈبیاں (جن کی دیا سلائیاں جلتی نہ تھیں)، پستول (جن میں سے گولی کی بجائے پانی نکلتا تھا)، قلم اور پنسلیں (جو لکھتے نہ تھے)، سرخ اور نیلی بوتلیں (جن میں ایک لٹر پانی ڈالو تو دو لٹر پانی نکلتا تھا)، پر اسرار لفافے (جن میں سے چاہو تو مچھلی نکالو، چاہو تو گل دستہ)۔ مجھے دیکھ کر ایک لمبا تڑنگا آدمی میری جانب بڑھا "تم جانوروں والی دکان سے آئے ہو ناں؟"

"حیرت کی کوئی بات نہیں" اس نے مجھے حیران دیکھ کر کہا "میرا نام لاری ہے۔ مجھے میری بہن مولی نے فون کرکے سب کچھ بتادیا ہے۔ تو وہ مداری کا بچہ پھر لوگوں کو لوٹنے کے لئے شہر میں آگیا ہے؟۔"

"جی ہاں کیا آپ میرے پیسے اس سے واپس دلوا دیں گے؟ اس نے جھوٹ بولا تھا کہ یہ طوطا بولتا ہے" میں نے کہا۔

"تب تو تم اس کی چال میں آگئے۔ یہ طوطا اس لئے نہیں بولے گا کہ یہ سن نہیں سکتا۔ یہ بہرا ہے۔"

"تب تو مم ---- مم ----" میں نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم فکر نہ کرو۔ ہم چال کا جواب چال سے دیں گے اور اس سے تمہاری رقم نکلوا لیں گے۔ مجھے اس سے زیادہ چالیں آتی ہیں۔ انسان کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں اور بہت سارے لوگ آنکھیں تو کھلی رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ یہ دیکھو۔ میں فرش پر سے یہ تیلی اٹھا رہا ہوں"۔

"یہ تو جلی ہوئی ہے" میں بولا

"ہاں، جلی ہوئی ہے" اس نے کہا۔

"لیکن میں اسے ماچس کی ڈبیا پر رگڑوں گا تو یہ جلے گی" اس نے کہا۔ اس نے وہ تیلی ماچس پر رگڑی تو وہ واقعی جل گئی!

"یہ --- یہ --- یہ کیسے ہوا؟" میں حیران رہ گیا تھا۔ مجھ سے بات بھی نہ ہو رہی تھی۔

"یہ جلی ہوئی تیلی نہ تھی۔ میں نے اس پر سیاہی لگا کر اسے نیچے پھینک دیا تھا۔ تمہیں آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود نظر نہیں آیا۔ اب دیکھو میں وہی چیز لکھ سکتا ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔"

"یہ ناممکن ہے" میں نے کہا۔

"نہیں۔ یہ ممکن ہے۔" یہ کہ کر لاری نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور پھر اسے الٹا دیا۔ پھر مجھ سے پوچھا "تم کیا سوچ رہے تھے؟"

"بس کا ٹکٹ ------" میں نے جواب دیا۔

لاری نے کاغذ الٹ دیا، اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ اس پر دو لفظ لکھے ہوئے تھے "بالکل وہی" میں پھر دھوکا کھا گیا تھا! لاری نے اگلے دن میرے ساتھ مداری کے پاس جانے کا وعدہ کیا۔ جب میں اس کے پاس گیا تو اس نے کہا "یہ سب ہاتھ کی صفائی ہے۔ مداری کے ہاتھوں پر نظر رکھو اور وہ جو کرے، اسے غور سے دیکھو۔ تم اس کی چالاکی سمجھ جاؤ گے۔"

جلد ہی ہم مداری کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اس وقت ایک آدمی کا نوٹ جیب میں ڈال رہا تھا "مجھے افسوس ہے، بھائی جان، مہربان، قدر دان۔ آپ کا نوٹ گیا۔ آپ نے غلط پیالی بتائی۔ اب پھر یہ کھیل کھیلتے ہیں۔"

"ٹھہرو، میرے بھائی!" لاری نے کہا۔

مداری اس کی طرف دیکھ کر غصے سے بولا "تم کیوں آئے ہو یہاں؟"

لاری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور لوگوں سے کہنے لگا "دیکھئے صاحبان، مہربان، قدر دان۔ یہ مداری میرا دوست ہے۔ یہ آپ کو اپنا کرتب دکھا چکا۔ اب میں آپ کو اپنا کرتب دکھاؤں گا۔ کسی کے پاس رومال ہو گا؟" اسے کسی نے رومال دے دیا۔

"اور کسی کے پاس دو پونڈ کا نوٹ ہو گا؟" لاری نے پوچھا۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے رہے۔ کسی نے اسے نوٹ نہ دیا۔ اس نے مداری کی میز پر رکھا ہوا دو پونڈ کا نوٹ اٹھالیا، جو اس نے انعام میں دینے کے لئے رکھا تھا "یہ رہا دو پونڈ کا نوٹ، میرے مداری بھائی کا۔ مداری بھائی، گھبراؤ نہیں۔ میں نے تمہارا نوٹ صرف کرتب دکھانے کے لئے لیا ہے۔"

یہ کہ کر لاری نے دو پونڈ کا نوٹ رومال میں رکھا اور پھر اسے درمیان سے پکڑ کر نیچے لٹکا دیا۔

"دیکھئے، مہربان، قدر دان۔ میرے ہاتھ میں رومال ہے اور رومال میں دو پونڈ کا نوٹ ہے۔ جس کسی کو شک ہو

آکر دیکھ لے۔" لاری نے کہا۔ کئی لوگ آگے آئے اور باری باری رومال کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کو بتایا کہ نوٹ رومال کے اندر موجود ہے۔

اتنے میں ایک خاتون ادھر سے گزری۔ لاری نے اس سے کہا "آپ بھی دیکھ لیں بی بی، کہ رومال میں نوٹ ہے یا نہیں"۔ عورت نے رومال کے اندر ہاتھ ڈالا اور بولی "ہے۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں کرتب دکھانے لگا ہوں" لاری نے کہا۔

"مجھے نہیں دیکھنا کرتب ورتب۔ میں تو سبزی لینے جارہی ہوں" یہ کہہ کر وہ عورت چلی گئی۔

"ادھر آؤ لڑکے" لاری نے مجھے بلایا "یہ رومال لو اور اسے کھول کر سب کو دکھاؤ۔"

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ رومال کھولوں گا تو اس میں سے نوٹ ہی نکلے گا کیوں کہ اس پورے عرصے میں میری نظریں برابر لاری کے ہاتھ پر جمی رہی تھیں اور اس نے کچھ گڑبڑ نہ کی تھی۔

لیکن جب میں نے رومال کھولا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس میں سے دو پونڈ کے نوٹ کی بجائے میرا طوطا نکلا!

"مم --- مم --- میرا نوٹ کہاں ہے؟ مجھے واپس دو" مداری نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

لاری بولا "ایک کرتب تم نے دکھایا اور نوٹ کمائے۔ ایک کرتب میں نے دکھایا اور نوٹ کمایا۔ حساب برابر ہوگیا۔ تم بھولے بھالے لوگوں کو لوٹتے ہو۔ اگر تم ابھی اس شہر سے نہ گئے تو میں پولیس کو فون کرکے تمہیں پکڑوادوں گا--- بھاگتے ہو یا.......؟"

مداری نے آناً فاناً وہاں سے اپنا بوریا بستر گول کیا اور بھاگ نکلا۔ ہاں، وہ جاتے جاتے میرے ہاتھ سے اپنا طوطا لے گیا۔ مجھے بھی طوطے کا کوئی ملال نہ تھا۔ وہ بولتا تو تھا نہیں۔

جب لاری اور میں واپس اس کی دکان میں پہنچے تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے پوچھا "آخر نوٹ کیسے غائب ہوگیا اور طوطا رومال میں کیسے آگیا جب کہ میری نظریں مسلسل تمہارے ہاتھوں پر تھیں اور میں نے پلکیں تک نہ جھپکی

تھیں؟ تم نے جیبوں میں ہاتھ بھی نہ ڈالے تھے.... پھر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟"

"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ تم آنکھیں تو کھلی رکھتے ہو، مگر دیکھتے نہیں" لاری مسکرا کر بولا۔

"مگر میں تو تمام وقت تمہارے ہاتھوں کو دیکھتا رہا تھا" میں نے حیرت سے کہا۔

"اور اسی لئے تم نے اس خاتون کو نہیں دیکھا جس نے رومال میں ہاتھ ڈال کر نوٹ دیکھا تھا" لاری نے کہا۔

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں نے کہا "وہ خاتون --- اس خاتون نے ہی وہ نوٹ رومال سے نکالا اور اس کی جگہ طوطا رکھ دیا۔"

"ہاں - تم ٹھیک سمجھے" لاری بولا۔

"اور وہ تھی کون؟" میں نے پوچھا۔

"میری بہن، مولی۔ اور یہ رہا وہ دو پونڈ کا نوٹ۔ اب تم اس نوٹ سے میری بہن کی دکان پر جا کر بولنے والا طوطا خرید سکتے ہو"۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ لے لیا۔

"اور یہ ایک کرتبوں کی کتاب ہے۔ یہ میری جانب سے تمہارے لئے ایک تحفہ۔ اسے پڑھ کر تم بھی کرتب دکھا سکتے ہو۔ لیکن ذرا ٹھہرو۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میں نے اس کتاب کے صفحہ نمبر 10 پر کس لفظ کے نیچے لکیر کھینچی ہے؟"

"نہیں، جناب" میں نے کہا۔

"کوشش تو کرو" وہ بولا۔

"No" میں نے زور سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یہی وہ لفظ ہے جس کے نیچے میں نے لائن لگائی ہے" یہ کہہ کر لاری نے کتاب کا صفحہ نمبر 10 مجھے دکھایا جس پر لفظ "No" کے نیچے لکیر لگی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں!

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : سہیل اصغر راجا، موہڑی شریف

- جس نے ہم سائے کو تکلیف پہنچائی، وہ مومن نہیں۔ (حضرت محمد ﷺ)

مرسلہ : محمد عدیل دانش، لانڈھی کراچی

- اللہ تعالیٰ کو ماننے کے بعد بہترین دانائی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ (حضرت محمد ﷺ)
- بے عمل عالم کی مثال ایسی ہے جیسے اندھے کے ہاتھ مشعل۔ دوسرے اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور وہ خود اس سے محروم رہتا ہے۔ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

مرسلہ : حبیب اللہ بشیر، گجرات

- تین عمل ایسے ہیں جو انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتے ہیں (1) صدقہ جاریہ (2) وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں (3) نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے۔ (حضرت محمد ﷺ)
- اچھا دوست خدا کا دیا ہوا بہترین تحفہ ہے۔ (برنارڈ شاہ)
- عقل مند کی پہچان غصے کے وقت ہوتی ہے۔ (سقراط)

مرسلہ : محمد امین پرنس، میاں چنوں

- برے لوگوں سے ڈرو، اور جو اچھے ہیں ان سے بھی ڈرتے رہو۔ (حضرت لقمان)
- بھوکا سو رہنا، قرض دار ہو کر اٹھنے سے بہتر ہے۔ (بابا فرید گنج شکرؒ)

مرسلہ : عمران اشرف، چک لالہ راول پنڈی

- ایک عالم کی طاقت ایک لاکھ جاہلوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ (بایزید بسطامیؒ)
- ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ (شیکسپئر)
- بات کو پہلے دیر تک سوچو، پھر منہ سے نکالو، اور پھر اس پر عمل کرو۔ (افلاطون)

مرسلہ : عامر نذیر منہاس، سیال کوٹ

- زبان کو قابو رکھو، کیوں کہ بے احتیاطی سے نکل جانے والی بات واپس نہیں آتی۔ (بنجمن فرینکلن)

مرسلہ : صائمہ صدف، سرگودھا

- دوست کو نصیحت تنہائی میں کرو، اور اس کی تعریف سب کے سامنے کرو۔ (سائرس)

مرسلہ : آصفہ بھٹی، ڈسکہ

- زیادہ باتیں کرنا، چاہے وہ کتنی ہی اچھی ہوں، دیوانگی کی علامت ہے۔ (ارسطو)
- کسی کو نصیحت نہ کرو۔ کیوں کہ بے وقوف سنتا نہیں اور عقل مند کو اس کی ضرورت نہیں۔ (برنارڈ شا)
- زندگی کا ایک مقصد بنا لیجئے۔ پھر اپنی ساری طاقت اس کو حاصل کرنے میں لگا دیجئے۔ آپ یقیناً کام یاب ہوں گے۔ (بقراط)
- جاہل کی بات کا سب سے اچھا جواب خاموشی ہے۔ (بطلیموس)

مرسلہ : شکیل احمد، واہ چھاؤنی

- کتابوں کو زمین پر نہ گرنے دیا کرو۔ کتابیں انسان کو آسمان پر لے جاتی ہیں۔ (افلاطون)
- علم سمندر کی مانند ہے۔ اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کنارے پر نہ کھڑے رہو بلکہ گہرائی میں اترتے چلے جاؤ۔ (محمد علی جوہر)

مرسلہ : ایم۔ ایس۔ اعوان، پوٹہ ڈیرہ اسماعیل خان

- مہمان کے آگے تھوڑا کھانا رکھنا بے مروتی اور حد سے زیادہ رکھنا تکبر ہے۔ (امام غزالیؒ)

مرسلہ : عبدالرؤف روفی، ملتان چھاؤنی

- گفت گو چاندی ہے تو خاموشی سونا۔ (لقمان حکیم)

اشفاق احمد خاں

بلا عُنوان

بچے گھر کے ماحول سے بہت اثر لیتے ہیں۔ وہ جو کچھ اپنے بڑوں کو کرتا دیکھتے ہیں، خود بھی ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پانچ سالہ فہد اس معاملے میں بہت تیز تھا۔ ٹیلی فون پکڑ کر ہیلو ہیلو کرنا اس نے ابھی چند دن پہلے ہی سیکھا تھا۔ اس کے شوق کو دیکھ کر ہی اس کے ابو نے اسے ٹیلی فون کرنا سکھایا تھا۔ اسے پچاس تک گنتی آتی تھی، اس لئے اس کو اپنے ابو کے دفتر کا فون نمبر، ہسپتال اور پولیس اسٹیشن کے نمبر یاد ہوگئے تھے۔

یہ تو ایک اچھی عادت تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اب اس کو کیا کہئے کہ ایک دن اس نے اپنے ابو کی سگرٹ کی ڈبیا میں سے سگرٹ نکالا اور ماچس کی تیلی جلا کر اس کو سلگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ابو کی نظر پڑ گئی۔ وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گئے کہ وہ یہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جو کچھ وہ کریں گے، بچے بھی ویسا ہی کرنے کی کوشش کریں گے۔ چناں چہ انہوں نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا۔

فہد کا بھائی، یاسر، اس سے دو سال بڑا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے اسکول بند تھے۔ اس لئے وہ اور فہد مل کر خوب شرارتیں کرتے تھے۔ لان میں کرکٹ کھیلنا تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اور کبھی کبھی جب امی ابو گھر پر نہ ہوں تو وہ چور سپاہی کھیلتے تھے۔ آج کا دن بھی اتفاق سے ایسا ہی دن تھا۔ ان کے ابو اور امی ایک دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ پہلے تو ان دونوں نے کرکٹ کھیلی اور پھر ٹی وی دیکھنے لگے۔ لیکن جب ٹی وی پر ان کی دل چسپی کا کوئی پروگرام نہ آیا تو انہوں نے اکتا کر ٹی وی بند کر دیا۔

تب یاسر ابو کے کمرے میں گیا اور ان کی الماری میں سے ریوالور نکال لایا۔ فہد کا جی خوش ہوگیا۔ چور سپاہی کا کھیل اسے بہت پسند تھا۔ اس نے فلموں اور ڈراموں میں چوروں ڈاکوؤں کو بھاگتے اور پولیس کو ان کا پیچھا کرتے اور گولیاں چلاتے دیکھا تھا۔

چور تو فہد کو بہت برے لگتے تھے، اس لئے وہ ہمیشہ سپاہی بنتا تھا۔ یاسر ریوالور اس کے ہاتھ میں تھما کر خود چھپ گیا۔ اب فہد پولیس والوں کی طرح ایکشن بنا بنا کر اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ریوالور کو سامنے کر کے منہ سے فائر کی آواز نکالتا اور یاسر جھوٹ موٹ گولی کھا کر گر جاتا۔ اس سے پہلے کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ وہ ریوالور کی لب لبی کو دباتا تو کھٹاک کی آواز آتی۔

فہد نے یاسر کو ایک جگہ چھپے ہوئے دیکھا تو ریوالور کی

نال اس کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔ ایک زور دار دھماکا ہوا اور فہد نیچے گر پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہوش بحال ہوئے تو یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ یاسر کی ٹانگ سے خون نکل رہا ہے اور وہ بے ہوش پڑا ہے۔ اس نے فوراً برابر والے انکل ربانی کے گھر کی طرف دوڑ لگائی۔ لیکن ان کے گیٹ پر تالا دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ کسی اور کو نہ وہ جانتا تھا اور نہ کسی کے گھر گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا واپس آیا۔ یاسر اسی طرح بے حرکت پڑا تھا۔ وہ کرسی گھسیٹتا ہوا ٹیلی فون سیٹ کے قریب لایا اور اوپر چڑھ کر ابو کے دفتر کا نمبر ڈائل کیا۔ لیکن وہ تو دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ اب اس نے ہسپتال کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ہیلو کہا گیا۔

"ہیلو!" فہد نے رونی سی آواز میں کہا "میرے بھائی کے گولی لگ گئی ہے!"

دوسری طرف کا آدمی اس کی بات سن کر چونک اٹھا۔ وہ ڈاکٹر اشعر تھا' انتہائی فرض شناس اور محنتی۔ ایک چھوٹے بچے کی آواز سن کر وہ فوراً چوکس ہوگیا۔

"ہیلو! --- ہاں' بیٹے؟ آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میرے بھائی یاسر کے گولی لگ گئی ہے!" فہد نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹے' آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟" ڈاکٹر اشعر نے پوچھا۔

"اپنے گھر سے بول رہا ہوں" فہد نے روتے ہوئے کہا۔

"بیٹے' گھر کہاں ہے آپ کا؟ جلدی بتائیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"گھر؟ گھر -- ہمارے اسکول کے قریب ہے" فہد نے بتایا۔

ڈاکٹر اشعر کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ شاید بچے کو اسکول کا نام آتا ہو اور وہ اس سے اس علاقے کا اندازہ کر سکے۔

"بیٹے' آپ کے اسکول کا نام کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پتا نہیں" فہد بولا۔

ڈاکٹر اشعر پریشان ہوگیا۔ اس نے کہا "آپ کو اپنے گھر کا علم نہیں۔ اسکول کا نام بھی نہیں معلوم۔ اچھا' آپ ذرا انتظار کریں۔ فون بند نہ کرنا۔"

وہ ریسیور میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے سے اس نے پولیس اسٹیشن فون کیا اور پولیس سے مدد کی درخواست کی۔ پولیس کی موبائل گاڑی پانچ منٹ میں ہسپتال پہنچ گئی۔ اس وقت تک ڈاکٹر اشعر فون پر فہد سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اس کا نام اور سارا واقعہ کرید کرید کر پوچھا تھا۔ اس کے امی ابو کے متعلق بھی معلوم کیا تھا۔ لیکن اسے فہد کے گھر کا پتا معلوم نہ ہو سکا۔

آخر پولیس نے اس علاقے کے ایکسچینج سے رابطہ کیا۔ ایکسچینج سے انہیں بتایا گیا کہ فون علی ٹاؤن سے کیا جارہا

ہے۔ چوں کہ علی ٹاؤن کا علاقہ دوسرا تھا' اس لئے اس کا ایکسچینج بھی دوسرا تھا لیکن اب علاقے کا پتا چل گیا تھا۔ اس لئے پولیس والے ڈاکٹر اشعر کو بچے کو باتوں میں لگانے کا کہہ کر علی ٹاؤن کے ٹیلی فون ایکسچینج گئے۔ کسی اور معاملے میں شاید وہ اتنی تیزی نہ دکھاتے' لیکن ایک معصوم بچے کی خاطر وہ تیز رفتاری کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ ایکسچینج سے انہوں نے نہ صرف فہد کے گھر کے ٹیلی فون نمبر کا پتا چلایا بلکہ اس کے گھر کا پتا بھی حاصل کرلیا۔ ٹیلی فون آپریٹر کی مدد سے انہوں نے ڈاکٹر اشعر اور فہد سے بات کی تو ڈاکٹر اشعر نے ان سے پوچھا:

"کچھ پتا چلا' انسپکٹر صاحب؟"

"جی' ڈاکٹر صاحب۔ آپ علی ٹاؤن کے مکان نمبر 12 پر ایمبولینس لے کر فوراً پہنچیں" انسپکٹر نے کہا۔

پولیس اور ایمبولینس تقریباً ساتھ ساتھ وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر اشعر دو نرسوں کے ساتھ اسٹریچر اٹھا کر اندر گیا۔ فہد یاسر کے قریب بیٹھا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اب تک پتا نہیں اس نے اپنے آپ کو کیسے سنبھالا تھا۔ ڈاکٹر اشعر نے یاسر کی نبض چیک کی۔ وہ ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ پستول کی گولی اس کی بائیں ٹانگ میں لگی تھی۔ لیکن ہڈی بچ گئی تھی۔ البتہ خون کافی بہہ گیا تھا۔

نرسوں نے یاسر کو اسٹریچر پر ڈالا اور ڈاکٹر اشعر اسے ایمبولینس میں لٹا کر ہسپتال لے گیا۔ پولیس والے وہیں ٹھہر گئے۔ انہیں فہد کے والدین کا انتظار تھا۔

ہسپتال پہنچ کر یاسر کو ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا اور ایکسرے کرکے آپریشن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس کو خون کی تین بوتلیں دی گئیں۔ تقریباً دو گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ڈاکٹر یاسر کی جان بچانے میں کام یاب ہوگئے۔

فہد کے ابو امی دعوت سے واپس آئے تو بڑے خوش گوار موڈ میں تھے۔ لیکن اپنی کوٹھی کے گیٹ پر پولیس کے سپاہی کھڑے دیکھ کر ان کے دل دھڑکنے لگے۔ پولیس انسپکٹر نے جب انہیں سارا واقعہ بتایا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ہسپتال پہنچے۔ فہد امی سے لپٹ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر اشعر نے اس کے امی اور ابو کو تسلی دی اور بتایا کہ ان کا بیٹا خطرے سے باہر ہے۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ڈاکٹر اشعر نے ان سے کہا:

"آج کا یہ خوف ناک حادثہ سراسر آپ کی لاپروائی کی وجہ سے پیش آیا۔ آپ نے بھرا ہوا ریوالور الماری میں رکھا اور الماری کو کھلا چھوڑ دیا۔ اور پھر غضب یہ کیا کہ ریوالور کا سیفٹی لاک بھی نہیں لگایا"۔

فہد کے ابو سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ لیکن اب انہوں نے عہد کرلیا تھا کہ آئندہ وہ ایسی لاپروائی نہیں کریں گے۔ اس دکھ کے ساتھ انہیں اس بات کی خوشی بھی تھی کہ انہوں نے فہد کو ٹیلی فون کرنا سکھا دیا تھا اور اس نے ہسپتال کا فون نمبر یاد رکھا تھا۔

آپ کی تحریر کیوں شائع نہیں ہوتی؟

اس لیے کہ آپ ضروری باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔ اگر اپنی تحریر شائع کروانا چاہتے ہیں تو ■ پہلے صفحے پر عنوان کے ساتھ پورا نام اور پتا درج کریں۔ ■ صاف ستھرا اور خوش خط لکھیں۔ ■ ایک سطر چھوڑ کے لکھیں۔ ■ پنسل سے نہ لکھیں۔ ■ اپنی تمام تحریریں الگ الگ کاغذ پر لکھیں۔ ■ کورن تصویر یا صفحے کے ساتھ ہیں آپ کریں، بلا عنوان، آپ بھی پوچھیے، آئیے دوست بنائیں، آئیے مسکرائیں۔ ساتھی ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں کہ آپ بھی لکھیے (منتخب ادیب) اور آپ کا خط ملا۔ ایک لفافے میں دوطرفی علی حدا الگ لفافے میں سب لفافوں پر اُن کے شعبوں کا نام لکھ کر ارسال کریں۔ اپنی تحریریں ساتھی اس پتے پر ارسال کر سکتے ہیں: ایڈیٹر ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ بن بادیس (ایمپریس) روڈ لاہور۔

تعارف اللہ خاوری

گرمی آئی

گرمی، گرمی، آئی گرمی
ہائے گرمی، ہائے گرمی
سورج نے بھی رنگ دکھایا
جلتی دھوپ کو لائی گرمی
کوٹ اور مفلر بھاگے سارے
ململ کُرتا لائی گرمی
گھر میں دبکے بیٹھے ہیں سب
اِس غضب کی آئی گرمی
اِکّا دُکّا لوگ ہیں باہر
یہ وِیرانی لائی گرمی
سب کرتے ہیں توبہ! توبہ!
کون ہے جس کو بھائی گرمی
نہ کرنا گرمی کی بُرائی
ٹھنڈے شربت لائی گرمی
اے تعارُف آؤ پی لیں
لسّی، ستّو لائی گرمی

ڈاکٹر رضوان ثاقب

مُرّہ واپس آگیا

Sharjeel Ahmed

میرا نام عرفان ہے میری عمر دس سال ہے، میں چھٹی جماعت میں پڑھتا ہوں اور فیصل آباد میں رہتا ہوں۔ میرے ایک ماموں، عبدالغنی، مال چک میں رہتے ہیں۔ مال چک ضلع فیصل آباد کا ایک گاؤں ہے۔ ماموں کی زمین گاؤں سے کوئی دو اڑھائی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے زمین داروں کی طرح میرے ماموں نے بھی اپنا ڈیرا کھیتوں میں بنایا ہوا ہے۔ میں ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں، ماموں کے پاس جایا کرتا ہوں اور ڈیرے کے خالص دیہاتی ماحول سے خوب لطف اٹھاتا ہوں۔

ہمارے شہر کے لوگوں کا خیال ہے کہ گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کے جسم سے بدبو آتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں شہر کے تنگ و تاریک مکانوں کی گھٹن سے یہ کھلی فضا بہت بہتر ہے۔ نرم زمین میں اگی ہوئی ہری ہری گھاس کی خوش بو مجھے بہت بھلی لگتی ہے۔ پھر سبزیوں کی کیاری کے ارد گرد مکئی اور لوبیے کی باڑھ کا تو نظارہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سبزیوں کی حفاظت کے لئے سپاہی کھڑے ہوں۔ اور ہاں، صبح جب ماموں گائے کا دودھ دوہ رہے ہوتے ہیں، گھوڑا ہنہنا رہا ہوتا ہے، گائے بیل ایک ساتھ ڈکرا رہے ہوتے ہیں تو اس وقت مویشیوں کے کوٹھے سے آنے والی بو بھی مجھے بڑی خوش گوار محسوس ہوتی ہے۔

پچھلے سال میں جب ماموں کے ہاں آیا تھا تو ان کے ڈیرے پر کوئی کتا نہ تھا۔ لیکن اس دفعہ وہاں ایک خوب صورت کتا تھا۔ یہ کتا مجھے بہت اچھا لگا۔ ماموں نے بتایا "ڈبو ڈیرے کا رکھوالا ہے یہ ہر وقت ڈیرے کی باڑھ اور کوٹھے کی اینٹوں کو سونگھتا رہتا ہے اور خطرے کی ذرا سی بات بھی ہو تو فوراً بتا دیتا ہے۔ وہ اس تاک میں بھی رہتا ہے کہ کوئی جانور مل جائے تو اس کی تکا بوٹی کر دے۔ میں نے اسے بلیوں، نیولوں، چڑیوں اور فاختاؤں کے پیچھے بھاگنے کی اجازت تو دے رکھی ہے لیکن اسے ہمسایوں کے پالتو جانوروں کا پیچھا کرنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔"

آج جمعے کا دن تھا۔ میرے ماموں اور ممانی نے قصبے میں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ روز مرہ کے استعمال کی جو چیزیں ختم ہو گئی ہیں، وہ لائی جا سکیں۔ طے یہ پایا کہ میں ڈیرے پر رہوں اور وہ کام کروں جنہیں ماموں باقاعدگی سے کرتے ہیں۔

"عرفان بیٹے، کتے کا خیال رکھنا" ماموں نے موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے مجھے تاکید کی۔

"بیٹا' ڈبو رکھوالی کرنے کے لئے تو بڑا اچھا کتا ہے' لیکن اس کے شکار کے شوق نے ہمسایوں کے جانوروں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس لئے اس کی کڑی نگرانی کرنا" ممانی نے بھی ماموں کے ساتھ موٹرسائیکل پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ممانی' آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں اس کی پوری پوری نگرانی کروں گا" میں نے وعدہ کیا۔

جب میں ایک چھوٹی سی کیاری بنا کر اس میں کدو اور تربوز کے بیج بو رہا تھا تو ڈبو اس دوران میں میرے پاس کھڑا رہا۔ پھر میں ممانی کی ترکاریوں والی کیاری کو پانی دینے لگا تو ڈبو نالی کا پانی اچھال اچھال کر کھیلنے لگا۔ اس کے بعد میری ساری توجہ مویشیوں کے کوٹھے کی جانب ہوگئی۔ پہلے میں نے ماموں کے گھوڑے کو کھریرا کیا' پھر اس کی اگلی اور پچھلی ٹانگوں کو گھٹنوں تک دھویا' اس کے بعد کوٹھے کی صفائی کی' مویشیوں کو چارا ڈالا اور پھر گائے کا دودھ دوہنے لگا۔

دودھ دوہ کر میں ابھی کوٹھے سے باہر نکلا ہی تھا کہ دروازے پر ڈبو مل گیا۔ اس نے منہ میں ایک خرگوش پکڑا ہوا تھا جس کے لمبے لمبے کان نیچے کو لٹکے ہوئے تھے۔ لیکن وہ بہت گندہ اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے۔

"ارے ڈبو' یہ تم نے کیا کیا؟" میں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ماموں جان کا خرگوش نہیں ہے' کیوں کہ انہوں نے خرگوش نہیں پالے تھے۔ میں فورا اس جنگلے کی طرف بھاگا جو ہمارے اور ہمارے پڑوسی چودھری محمد علی کے درمیان تھا۔ میں نے چودھری محمد علی کے ڈیرے میں دیکھا تو مجھے وہاں خرگوشوں کے تین ڈربے نظر آئے۔ دو ڈربوں میں خرگوش تھے' اور وہ بالکل اس جیسے ہی تھے جیسا ڈبو نے اپنے منہ میں پکڑا ہوا تھا۔ لیکن تیسرا ڈربا بالکل خالی تھا۔ اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور ہوا میں جھول رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں فورا معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

"ارے ڈبو!" میں نے اپنا سر پکڑ کر کہا۔ اس کے علاوہ اور کوئی لفظ میرے منہ سے نہ نکلا۔

اب سوائے افسوس کے میں کر بھی کیا سکتا تھا' کیوں کہ یہ سب کچھ میری غفلت کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس ڈیرے کے مالک چودھری محمد علی' ڈیرے سے کچھ دور' کھیت میں کھرپے سے نلائی کرنے میں مصروف تھے۔ میں نے ان کو دیکھا تو وہ مجھے کچھ بھلے مانس سے لگے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں انہیں ساری بات سچ سچ بتادوں تو یہ مجھے معاف کردیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔

میں نے فورا خرگوش کو کتے کے منہ میں سے نکالا۔ اور اس سے ایسی بدبو آرہی تھی جیسے اس کے جسم کا کوئی حصہ کئی دن مٹی میں دفن رہنے کی وجہ سے گل سڑگیا ہو۔ میں اسے لے کر ٹیوب ویل کی طرف بھاگا اور اسے کھلے پانی میں خوب اچھی طرح دھویا۔ پھر اسے اپنی قمیص کے نیچے

چھپاکر دھوپ میں لے گیا۔ میں دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ رہا تھا۔ معافی صرف اس بات ہی کی نہیں کہ میں نے کتے کی نگرانی کرنے کی جو ذمے داری لی تھی' اسے پوری طرح نہ نبھایا تھا' بلکہ اس کام کی بھی معافی مانگ رہا تھا جو اس وقت میں کر رہا تھا۔

میں نے خرگوش کو سوکھنے کے لئے ایسی جگہ رکھ دیا جہاں اس پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ جب اس کی کھال دھوپ میں سوکھ کر چمک دار ہوگئی تو اسے لے کر چودھری محمد علی کے خرگوشوں کے دڑبوں کی طرف بھاگا۔ وہاں میں نے اسے خالی دڑبے میں رکھ کر اس کا دروازہ بند کر دیا۔

واپس آکر میں نے ڈبو سے کہا "کوئی بات نہیں۔ چودھری صاحب سوچیں گے کہ ان کا خرگوش کسی بیماری سے مرگیا ہے۔"

ڈبو نے میری بات کے جواب میں دم ہلائی اور کوں کوں کرنے لگا۔ اسی وقت میں نے ماموں کی موٹر سائیکل کی آواز سنی۔ میں بھاگ کر باہر گیا تاکہ سامان اٹھا کر کوٹھے میں لے جاؤں۔ ڈبو بھی میرے ساتھ تھا۔ ہم سامان کوٹھے میں رکھ رہے تھے کہ اچانک پچھلے دروازے سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ماموں' ممانی' میں اور ڈبو آواز کی طرف دوڑے۔

"یہ واپس آگیا! واپس آگیا! مردہ واپس آگیا! چودھری محمد علی چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔

ہم سب گھبرا کر باہر نکلے تو میں چودھری محمد علی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہا "یہ خرگوش پچھلے سوموار کو مرگیا تھا اور میں نے اسی روز اسے زمین میں دفن کردیا تھا۔ مگر آج یہ اتنے دن مٹی میں دفن رہنے کے بعد دوبارہ خود بخود دڑبے میں آگیا ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ چار پانچ دن دفن رہنے کے باوجود یہ بالکل ویسا ہی صاف ستھرا ہے جیسا کہ دفن کرنے سے پہلے تھا۔"

میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا گلا خشک ہوگیا ہو۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اصل بات بتادی تو میرے ماموں اور ممانی میری اس احمقانہ حرکت کو پسند نہیں کریں گے۔ لیکن میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ میں ان سے کچھ چھپاؤں۔ اس لئے اب تک جو کچھ ہوا تھا' میں انہیں بتانا چاہتا تھا۔

"میں بتاتا ہوں ------" آخر میں نے ہمت کرکے کہا۔

میری یہ آواز اتنی دھیمی بھی نہ تھی کہ کسی کو سنائی نہ دے سکے۔ لیکن پھر بھی میری بات کسی نے نہیں سنی۔ کیوں کہ چودھری محمد علی بار بار "واپس آگیا! مردہ واپس آگیا!" کہے جا رہے تھے' جب کہ ماموں اور ممانی حیرت سے ان کا منہ تک رہے تھے۔ اور ڈبو انہیں پریشان دیکھ کر

خود بھی پریشان ہو کر بھونک رہا تھا۔

"گناہ کبھی نہیں چھپتا" میری امی کہا کرتی تھیں۔ آج میں اس بات کا مطلب پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ "انکل' محمد علی" میں نے دوبارہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر مایوسی ہوئی۔ میرے منہ سے پوری بات نہیں نکلی۔ تھوڑی دیر بعد جب مجھے بے چین دیکھ کر سب لوگ میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے اپنی ساری قوت جمع کر کے کہا "انکل' یہ خرگوش میں نے وہاں رکھا تھا!"

اب میرے ماموں اور ممانی کی آنکھیں چودھری محمد علی کی آنکھوں سے بھی زیادہ کھل گئی تھیں اور وہ دونوں حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"تم نے اسے وہاں رکھا تھا؟" ممانی نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں' میں نے اس خرگوش کو دڑبے میں رکھا تھا" میں نے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟" ماموں' ممانی اور انکل محمد علی نے ایک ساتھ کہا۔

میں نے انہیں بتایا کہ جب میں نے ڈبو کے منہ میں خرگوش دیکھا تو یہ سمجھا کہ ڈبو نے اسے مارا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ چودھری صاحب بہت ناراض ہوں گے اور ہو سکتا ہے غصے میں آکر ڈبو کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ اس لئے میں خرگوش کو صاف کر کے دڑبے میں رکھ آیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ڈبو نے زمین کھود کر اس کی لاش نکالی ہے۔ یہ سن کر سارے لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔

اس رات جب میں نے رات کے کھانے سے پہلے دعا پڑھی تو اس دعا کے ساتھ اس دعا کا اضافہ بھی کرلیا "اے خدا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹا دیا' اور میری غفلت کی مجھے کوئی سزا نہیں دی۔"

(انگریزی کہانی سے ماخوذ)

بقیہ: سنہری چڑیا

میں تقسیم کردی۔ اس کے نتیجے میں کسانوں کی حالت بدل گئی اور وہ خوش حال ہوگئے۔ وہ اراضی کے مالک بنے تو خوب محنت سے کاشت کاری کرنے لگے اور زرعی پیداوار پہلے سے دوگنا ہوگئی۔ زرعی پیداوار بڑھی تو اناج سستا ہوگیا اور اناج سستا ہوا تو دوسری اشیا بھی سستی ہوگئیں۔

بادشاہ نے بچوں کے لئے گاؤں گاؤں سرکاری مدرسے قائم کردیئے۔ ان مدارس میں ان کو مفت تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ چند سالوں کے اندر ہی ملک سے جہالت کا خاتمہ ہوگیا۔

بادشاہ نے ہر گاؤں میں ہسپتال قائم کیا' جس میں لوگوں کا مفت علاج کیا جاتا تھا۔ اس نے سارے ملک میں پکی سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ اس سے تجارت چمک اٹھی۔ مسافروں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کے لئے اس نے اہم جگہوں پر سرائے بنوائیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے جابجا پولیس چوکیاں مقرر کیں۔

بادشاہ نے فوج کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ فوجیوں کی باقاعدہ تنخواہیں مقرر کیں اور ان کو جدید ہتھیاروں سے لیس کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رعایا کے اخلاق و کردار کی اصلاح کے لئے ادارے قائم کئے۔ اب بادشاہ اور اس کے بیوی بچوں نے سادہ زندگی بسر کرنا شروع کردی تھی' اس لئے رعایا نے بھی سادہ زندگی اختیار کرلی۔ بادشاہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ یتیموں' بیواؤں اور محتاجوں کے وظیفے مقرر کردیئے۔

ان اصلاحات کی بدولت لوگ خوش حال ہوگئے اور ملک امن و سلامتی کی جنت بن گیا۔ رعایا اپنے بادشاہ پر جان چھڑکنے لگی۔

کیا، کیوں، کیسے

چین کا نام چین کیوں رکھا گیا؟

چین بہت پرانا ملک ہے۔ شروع میں یہ کئی حصّوں میں بٹا ہوا تھا اور اِن حصّوں پر مختلف سردار حکومت کرتے تھے۔ لیکن آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے "چین شی ہُوانگ" نامی ایک سردار نے سارے ملک پر قبضہ کرلیا اور اُسی کے نام پر اِس ملک کا نام چین رکھا گیا۔ یہ چین کا پہلا بادشاہ تھا۔

کہتے ہیں کہ اِس بادشاہ کی تیرہ ہزار ایک سو چالیس بیویاں اور دو ہزار آٹھ سو بچّے تھے۔ اُس نے چین کی سرحد پر دُشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک نہایت مضبوط دیوار بنوائی تھی' جو ایک ہزار پانچ سو میل لمبی تھی۔ اِسے دیوارِ چین کہتے ہیں اور اِتنا زمانہ گزرنے کے باوجود ابھی تک موجود ہے۔ اگر کوئی چاند پر جاکر زمین کو دیکھے تو اِنسان کی بنائی ہوئی عمارتوں میں اُسے صرف دیوارِ چین ہی نظر آئے گی۔

تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے اِس دیوار کی بُنیادوں میں دس لاکھ مزدور زندہ دفن کر دیئے تھے تاکہ اُن کی ہڈیوں اور خون سے دیوار خوب مضبوط ہو جائے۔ پہلے زمانے کے بادشاہ بہُت ظالم اور سنگ دِل ہوتے تھے۔ اِس بادشاہ نے ایسا کیا تو کوئی تعجّب کی بات نہیں۔

مرتے وقت بادشاہ نے اپنی بیویوں اور بچّوں کو حکم دیا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ قبر میں دفن ہو جائیں۔ پتا نہیں انُھوں نے اُس کا یہ آخری حکم مانا یا نہیں؟

دُنیا کی کس زبان میں سب سے زیادہ اَلفاظ ہیں؟

انگریزی میں۔ اِس زبان میں پانچ لاکھ کے لگ بھگ الفاظ ہیں۔ ٹیکنیکل الفاظ اِن کے علاوہ ہیں جن کی تعداد تین لاکھ کے قریب ہے۔ لیکن انگریزی بولنے والے لوگ روزمرہ کی گُفت گُو میں دس ہزار سے زیادہ الفاظ اِستعمال نہیں کرتے۔

لوگ گنجے کیوں ہو جاتے ہیں؟

جس طرح ہمارے جِسم کے باقی حِصّوں کو غِذا کی ضرورت ہوتی ہے' اِسی طرح بالوں کو بھی ہوتی ہے۔ اگر سر کے مَسام بند ہو جائیں یا جِلد کسی بیماری کا شکار ہو جائے تو بالوں کو غذا نہیں ملتی اور وہ بھوکوں مرجاتے ہیں۔ پھر اُن کی جگہ نئے بال نہیں اُگتے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بال بڑھاپے تک آپ کا ساتھ دیں تو آپ انہیں صاف سُتھرا رکھئے۔ دن میں تین چار بار کنگھی کیجئے۔ انہیں گرد وغُبار سے بچایئے ، ہفتے میں دو تین بار کسی بڑھیا صابن یا شیمپو سے خوب مل مل کر دھویئے اور مُتوازن غذا کھایئے۔اور یاد رکھئے ! اب تک کوئی ایسی چیز ایجاد نہیں ہوئی ہے جو گنجوں کے سر پر دوبارہ بال اُگادے۔

گلیشیئر اور آئس برگ میں کیا فرق ہے؟

گلیشیئر برف کے اُس پہاڑ جیسے تودے کو کہتے ہیں جو کسی وادی میں بنتا ہے۔ برف کا یہ تودہ آہستہ آہستہ سمندر کی طرف کھسکتا رہتا ہے' یہاں تک کہ ایک دن سمندر میں جاگرتا ہے۔ لیکن سمندر میں گرنے سے پہلے اُس کے کئی ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور یہ ٹکڑے ہی آئس برگ کہلاتے ہیں۔ آئس برگ کا دسواں حصّہ پانی کی سطح کے اُوپر ہوتا ہے۔ باقی پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہ بحری جہازوں کے لئے بہُت خطرناک ہوتا ہے۔

بعض گلیشیئر پہاڑی علاقوں (مثلاً کوہ ہمالیہ' کوہ ایلپس) میں بنتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ سے نہیں کھسکتے۔ سیاچین گلیشیئر (جس کے لئے پاکستانی اور بھارتی فوجوں میں کئی بار

جھڑپ ہو چکی ہے) ایسا ہی ایک گلیشیئر ہے۔ یہ پاکستانی علاقے میں ہے، اور اِس کے ایک حصّے پر بھارت نے زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔

پلاسٹِک کیا ہے؟

ہم اپنی روزمرّہ زندگی میں جو چیزیں اِستعمال کرتے ہیں، اِن میں سے اکثر پلاسٹک کی ہوتی ہیں۔ آپ اپنے گھر کی چیزوں پر ایک نظر ڈالیئے۔ اُن میں سے زیادہ تر یا تو پوری کی پوری پلاسٹک کی ہوں گی، جیسے بجلی کے سوئچ اور پلگ، ٹیلی فون، کپڑے، بوتلیں، کھانے پینے کے برتن، قلم، کھلونے وغیرہ، یا ان کا کچھ حصّہ پلاسٹک کا ہوگا مثلاً ریڈیو، ٹی وی سیٹ وغیرہ۔ دُنیا میں پلاسٹک کا اِستعمال بہُت بڑھ گیا ہے، کیوں کہ یہ بہت سستا پڑتا ہے۔ اِسے آسانی سے کسی بھی شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے (پلاسٹک کے معنی بھی یہی ہیں) نرم اور لچک دار ہوتا ہے، اور چاہیں تو بہت سخت اور بے لچک بھی بن سکتا ہے۔ اِس کو زنگ نہیں لگتا اور یہ گلتا سڑتا نہیں۔ اِس میں بجلی کا کرنٹ سرایت نہیں کرتا۔ اِس لئے بجلی کی اکثر اشیا پلاسٹک کی بنائی جاتی ہیں۔

پلاسٹک انسان کا بنایا ہُوا "مسالا" ہے۔ لکڑی، کپاس، اُون یا چمڑے کی طرح یہ درختوں، پودوں یا جانوروں سے حاصل نہیں ہوتا، کارخانوں میں کیمیائی اشیا سے بنایا جاتا ہے۔ یہ کیمیائی اشیا کوئلے، تیل اور قُدرتی گیس سے حاصل کی جاتی ہیں۔ اِن میں ننھے ننھے سالمے (Molecules) ہوتے ہیں۔ جب اِن اشیا کو گرم کیا جاتا ہے تو اِن کے چھوٹے چھوٹے سالمے آپس میں جُڑ کر بڑے بڑے سالمے بن جاتے ہیں۔ مختلف کیمیائی اشیا سے مختلف شکلوں اور سائزوں کے بڑے بڑے سالمے حاصل کئے جاتے ہیں، اور اُن سے مختلف اَقسام کے پلاسٹک بنائے جاتے ہیں (مادّے کے کسی ٹکڑے کو مختلف حصّوں میں تقسیم کرتے جائیں تو آخر میں ایسے چھوٹے ذرّے رہ جائیں گے جو مزید تقسیم نہ ہوسکیں گے۔ اِنہی کو سالمہ کہتے ہیں۔ ایک سالمہ کئی ایٹموں سے مِل کر بنتا ہے)۔

پلاسٹک کو سانچے میں ڈال کر گرم کیا جاتا ہے۔ گرم ہوکر وہ (سانچے میں) پھیل جاتا ہے۔ پھر اُسے ٹھنڈا کیا جاتا ہے، جس سے وہ سخت ہوجاتا ہے اور سانچے کی جیسی شکل ہوتی ہے، ویسی ہی شکل اُس کی بن جاتی ہے۔ جو پلاسٹک گرم ہونے پر نرم ہوجاتا یا پگھل جاتا ہے، اُس سے پلیٹیں، گلاس، پیالے پیالیاں، بیگ وغیرہ جیسی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ دوسری قِسم کا پلاسٹک گرم ہونے سے سخت ہوجاتا ہے۔ اُس سے عموماً سریش، وارنش اور روغن (پینٹ) بنائے جاتے ہیں۔

جن چیزوں کو ہم نائلون کی اشیا کہتے ہیں، وہ بھی پلاسٹک ہی سے بنائی جاتی ہیں۔ پگھلے ہوئے پلاسٹک کو ایک مشین میں باریک سُوراخوں میں سے گزُارا جاتا ہے تو اُس کے مہین مہین دھاگے بن جاتے ہیں۔ اِن دھاگوں سے کپڑا اور دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

پلاسٹک جیسی مُفید اور سستی چیزیں عِلم کیمیا (Chemistry) کا کمال ہے۔ کیمیا دانوں نے کیمیائی اشیا سے اور بہت سی چیزیں بنائی ہیں۔ اِن میں وہ رنگ بھی شامل ہیں جن سے ہم کپڑے رنگتے ہیں، یا جو فرنیچر اور دیواروں وغیرہ پر کئے جاتے ہیں۔ آپ اِس رسالے میں جو رنگین تصویریں دیکھ رہے ہیں، اِنہیں بھی اِنہی رنگوں سے رنگین بنایا گیا ہے۔

بیماریوں سے بچنے یا اُن کا علاج کرنے کے لئے جو دوائیں تیّار کی جاتی ہیں، مصنوعی کھاد جو پیداوار بڑھانے کے لئے کھیتوں میں ڈالی جاتی ہے، کیڑے مار دوائیں جو فصلوں کے دُشمن کیڑے مکوڑوں کو ہلاک کرتی ہیں، اور اِن کے عِلاوہ بہُت سی دوسری چیزیں اُن کیمیائی اشیا سے تیّار کی جاتی ہیں جنہیں قدُرتی گیس (جو آپ کے چولھے میں جلتی ہے)، تیل اور کوئلے سے حاصِل کیا جاتا ہے۔ (س۔ل)

رفعت شاہین

دوستی کا امتحان

سمیع اور عادل بہترین دوست تھے۔ دونوں ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ کلاس فیلو بھی تھے۔ گھر بے شک دونوں کے قریب قریب نہ تھے، پھر بھی وہ زیادہ تر اکٹھے ہی رہتے تھے۔

ایک روز سمیع عادل کے گھر آیا "ہیلو ہیلو کیا ہو رہا ہے؟" وہ عادل کے کمرے میں داخل ہو کر بولا۔

"وعلیکم السلام" عادل نے اسے مسلمان ہونے کا احساس دلایا۔

سمیع سخت شرمندہ ہوا، بولا "معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں آج میں بہت خوش ہوں۔"

"اپنی خوشی کا اظہار تم اپنی تہذیب کے اندر رہ کر بھی تو کرسکتے ہو" عادل نے کہا۔

"میں معافی مانگ چکا ہوں" سمیع بولا۔

"چلو، معاف کیا۔ اب بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟" عادل نے مسکرا کر کہا۔

"میرے ماموں کی شادی ہے۔ مجھے اپنے چند سوٹ دکھاؤ" سمیع نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ دونوں اکثر کپڑوں اور چیزوں کا تبادلہ کرلیا کرتے تھے۔

"یار، میرے پاس تو صرف دو ہی سوٹ ہیں" عادل مسکین سی صورت بنا کر بولا "ایک تو وہ ہے جو اسکول کے ڈرامے میں فقیر کے رول میں پہنا تھا، اور دوسرا جو اب پہن رکھا ہے۔"

"مذاق چھوڑو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے، اور ہاں، اپنا سفید سوٹ ضرور دینا" سمیع بولا۔

"اور واسکٹ، کرتا شلوار بھی۔ اور ساتھ کھسا بھی" عادل نے ہنس کر کہا۔

"ہاں، مگر کھسا میرے پاس ہے۔" سمیع نے کہا اور شکر کیا کہ عادل سنجیدہ ہوگیا ہے۔

عادل اٹھ کر کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھا۔ کپڑے نکالتے ہوئے نجانے اسے کیا ہوا کہ اچانک اس کا دایاں ہاتھ اپنی قمیص کی جیب میں گیا اور پھر سفید کرتے کی پہلو والی جیب میں گھستا چلا گیا۔ پھر دونوں سوٹ پلاسٹک بیگ میں ڈال کر اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور ایک لمبا سا

sharjie

سانس لے کر وہ سمیع کی جانب مڑا جو اس کی حساب کی کاپی دیکھ رہا تھا۔

"لو، بھئی --- ہماری دوستی میں یوں ہی عیش کرو گے" عادل نے کہا۔ مگر سمیع کوئی جواب دیئے بغیر ہاتھ ہلاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ شاید اسے بہت جلدی تھی۔

"گلے تو ملتے جاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی" عادل نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"سوری، ویری سوری" سمیع عادل سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا "خدا حافظ! اب چار روز بعد ملاقات ہوگی" یہ کہ کر وہ باہر نکل گیا۔

سمیع کو شادی میں گئے آج پانچواں روز تھا۔ "اسے چار روز بعد واپس آجانا چاہئے تھا۔ شاید ماموں نے روک لیا ہو" عادل نے سوچا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو وہ مسجد میں چلا گیا۔ وہاں اس نے سمیع کو وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ اسے سخت غصہ آیا کہ میں اس کے لئے اتنا پریشان ہوں اور یہ مجھے ملنے تک نہیں آیا۔

سمیع وضو کر کے اٹھا تو اس کی نظر عادل پر پڑی، جو وضو کر رہا تھا۔ اس نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ جماعت کھڑی ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے دوسری صف میں کھڑا ہوگیا۔ نماز پڑھ کر اس نے دیکھا کہ عادل دعا مانگ رہا ہے۔ وہ انتظار کرنے لگا کہ پچھلی صفیں خالی ہوں تو وہ بھی اٹھے۔ کچھ دیر بعد پچھلی صفوں کے لوگ آہستہ آہستہ اٹھنے لگے اور باہر نکلنے کے لئے راستہ بن گیا۔

عادل بھی اٹھ کر دروازے کی طرف جارہا تھا۔ سمیع نے اسے دروازے پر ہی آلیا اور بولا "السلام علیکم، بھائی عادل" دونوں نے مصافحہ کیا۔ سمیع کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر عادل بولا "کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بس ابھی آرہا ہوں۔ ابھی تو گھر بھی نہیں گیا۔ ہم لوگ بس سے اترے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا، گھر جاتے جاتے دیر ہو جائے گی، لہٰذا امی اور باجی کو گھر بھیج کر خود اس مسجد میں چلا آیا۔"

سمیع نے پوری بات بتائی تو عادل کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے کہا۔ "اچھا، میرے گھر کب آؤ گے؟"

؟ابھی، تھوڑی دیر بعد۔ تمہارے کپڑے بھی لیتا آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!" یہ کہ کر وہ چلا گیا۔

عادل اپنی سوچ پر خود ہی شرمندہ ہوگیا "شکر ہے، سمیع کو احساس نہیں ہوا ورنہ وہ کیا سوچتا۔"

رات کو تقریباً آٹھ بجے سمیع عادل کے گھر آیا۔ اس نے کپڑوں کا تھیلا عادل کو دیا۔ تھوڑی دیر باتیں کیں اور پھر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عادل کپڑوں کے تھیلے پر جھپٹا۔ کپڑے نکال کر ان کی جیبیں ٹٹولیں۔ مگر بے سود۔ وہ جو کچھ تلاش کر رہا تھا، وہ ان کپڑوں کی جیبوں میں نہ تھا۔ اچانک غصے سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں "سمیع! میں نے تمہیں ایسا دوست تو ہرگز نہ سمجھا تھا" وہ بڑبڑایا "کتنا مان تھا مجھے تم پر۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم ----" وہ مارے دکھ کے جملہ بھی مکمل نہ کرسکا۔ تمام رات اس نے بے چینی سے گزاری۔ صبح اسکول بھی نہ جاسکا۔ امی نے وجہ پوچھی تو بہانہ کردیا۔ امی کام میں مصروف تھیں۔ انہوں نے زیادہ دھیان نہ دیا۔

دوپہر کے ایک بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ عادل نے دروازہ کھولا۔ سامنے، اسکول کی یونی فارم میں، سمیع کھڑا تھا۔ وہ اسکول سے، چھٹی کے بعد، سیدھا اسی کی طرف آیا تھا۔

"آؤ سمیع، کیسے آئے؟" عادل نے بڑے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گے؟" سمیع نے کہا۔

"نہیں" عادل نے کہا۔

سمیع اس کے انکار پر چونکا "کیا مطلب؟"

"مطلب کچھ نہیں۔ بس آئندہ تم مجھ سے مت ملنا۔ مجھے تم جیسے دوست کی ضرورت نہیں" عادل نے نفرت سے منہ پھیر کر کہا۔

سمیع کو اس کی امید نہ تھی۔ اس کا بہترین دوست اس سے دوستی ختم کر رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیوں؟ وہ مرے مرے قدموں سے گھر پہنچا۔ وہاں اس کے بڑے بھائی 'ضمیر احمد' آئے ہوئے تھے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں کراچی میں رہتے تھے۔ ان سے مل کر وہ عادل کو بھول گیا۔ مگر جب وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے تو عادل کی باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگیں۔ "آئندہ مجھ سے مت ملنا۔ مجھے تم جیسے دوستوں کی ضرورت نہیں۔ یہ کیا کہہ دیا عادل، تم نے؟" سمیع دکھ سے بڑبڑایا۔

اسی لمحے ضمیر بھائی جان کمرے میں داخل ہوئے۔ سمیع کو پریشان دیکھ کر بولے "سمیع، کیا بات ہے؟"

"کچھ.. کچھ بھی نہیں" سمیع فوراً سنبھلا۔

"پھر کیا سوچا تم نے میرے ساتھ کراچی جانے کے بارے میں؟" ضمیر بھائی نے پوچھا۔

"ارے، نہیں، بھائی جان۔ میں یہیں پڑھوں گا" اس کے ذہن میں اپنے دوست سمیع کا چہرہ آیا جس کے بغیر وہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ دھندلا گیا۔ "تم نے ایسا کیوں کہا، عادل؟" اس نے دکھ سے سوچا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے فیصلہ کرلیا "ٹھیک ہے، بھائی جان .... میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"کیا واقعی؟" ضمیر بھائی جان خوش ہوگئے۔ "مگر تمہارے عزیز دوست کا کیا بنے گا؟"

"دوست؟ اب وہ دوست نہیں رہا" سمیع نے تلخی سے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" ضمیر بھائی بولے۔ جواب میں سمیع نے ساری بات انہیں بتادی۔ اسی لمحے باجی کمرے میں داخل ہوئیں "سمیع، یہ پن تمہارا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ کو کہاں سے ملا؟" سمیع نے الٹ پلٹ کر پن کو دیکھا۔

"مجھے یاد آرہا ہے کہ شادی میں جانے سے پہلے تم نے کچھ کپڑے مجھے استری کرنے کو دیئے تھے۔ شاید اپنے کسی دوست کے لائے تھے۔ ان کپڑوں میں سے کوئی چیز گر کر میز کے نیچے چلی گئی تھی۔ ہمیں دیر ہو رہی تھی، لہٰذا میں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ آج صفائی کرتے ہوئے یہ پن ملا ہے۔ میرے خیال میں یہی وہ چیز ہے جو کپڑوں میں سے گری تھی" باجی نے عادت کے مطابق لمبی بات کی۔

باجی تو یہ کہہ کر چلی گئیں، مگر سمیع ہونقوں کی طرح کبھی پن کو دیکھتا اور کبھی بھائی جان کو۔ ضمیر بھائی کسی گہری

سوچ میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھے، پن ہاتھ میں لیا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

تقریباً 20 منٹ بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے اور بولے "سمیع، تھوڑی دیر غور کرو--- عادل سے تم نے کپڑے لئے اس کے بعد تم نے عادل کو کپڑے واپس کئے تو اس کا رویہ تمہارے ساتھ دوستانہ تھا۔ لیکن جب دوبارہ اس سے ملنے گئے تو اس نے تمہارے ساتھ غلط برتاؤ کیا۔ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

سمیع کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "عادل نے میری دوستی کو اس معمولی قلم سے پرکھا۔ اتنا گھٹیا سمجھا اس نے مجھے۔ میں یہ قلم اس کے منہ پر دے ماروں گا۔"

"سمیع! تسلی سے سوچو--- عادل نے تمہارا امتحان لینا چاہا تھا" بھائی جان بولے

"اس نے کیا سمجھ کر، میرا امتحان لیا؟ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔" سمیع نے کہا۔

"اور اگر وہ خود چل کر تمہارے پاس آجائے تو؟"

بھائی جان نے کہا "میرے خیال میں جو شخص اپنی غلطی پر شرمندہ ہو، اسے مزید شرمندگی سے بچا لینا بھی دوستی کے زمرے میں آتا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ باہر عادل کھڑا تھا۔ بے حد شرمندہ۔

"مجھے معاف کردو، میرے دوست۔ ضمیر بھائی نے مجھے ساری بات بتادی ہے۔ میں بہت شرمندہ-------"

سمیع نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ اتنا ہی کافی ہے"

"اپنے دوست کو کسی امتحان میں نہ ڈالو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی مجبوری کی وجہ سے تمہارے امتحان میں پورا نہ اتر سکے اور تم اپنے بہترین دوست سے محروم ہو جاؤ" ضمیر بھائی نے دونوں کو نصیحت کی۔

****

کون صحیح؟ کون غلط؟

صالح کا کُتا گلہری یا بلّی کے پیچھے دوڑتا ہے تو صالح اُسے منع کرتا ہے۔

طالع کی بلّی چڑیا کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے تو طالع قہقہے لگاتا ہے۔

عفّت گُل اِعزاز

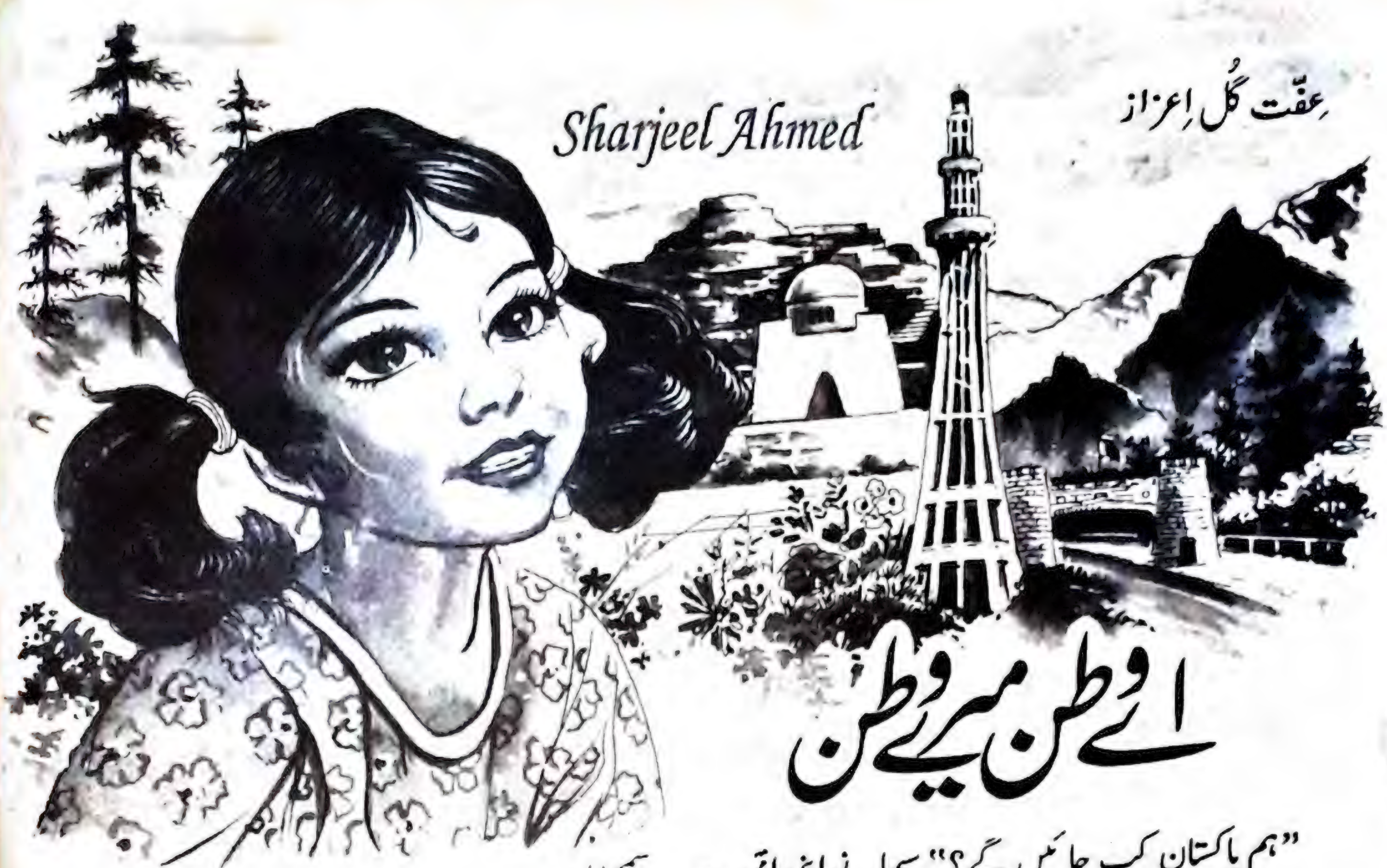

اے وطن میرے وطن

"ہم پاکستان کب جائیں گے؟" سیما نے اپنی امّی سے پوچھا۔

"بہت جلد۔ شاید اگلے مہینے" امی نے جواب دیا۔

"پاکستان بہت اچھا ہو گا ناں؟ جب میں اپنے ملک پاکستان جاؤں گی تو کتنا اچھا لگے گا" سیما نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہاں تمہیں سب کچھ بہت اچھا لگے گا۔ وہاں کی ہر چیز بہت اچھی ہے۔ وہاں کے زمین' آسمان' پہاڑ' دریا' پھول' پودے اور لوگ بہت اچھے ہیں۔ وہ ملک ہمارا ہے۔ ہمارا اپنا۔ خدا اسے سلامت رکھے!" امی نے محبت سے کہا۔

"امی اگر پاکستان بہت اچھا ہے تو پھر آپ امریکا کیوں آگئیں؟" سیما نے سوال کیا۔

"تمہارے ابّو کو یہاں بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس لئے تھوڑے عرصے کے لئے یہاں آگئے۔ کوئی ہمیشہ کے لئے تھوڑی آئے تھے" امی نے بتایا۔

"امریکا تو ہمارا ملک نہیں۔ ہمارا ملک تو پاکستان ہے ناں؟" سیما بولی۔

"ہم پاکستانی ہیں اور ہمارا ملک پاکستان ہے" امی نے سمجھایا۔

"امی' وہاں پر خالہ جان بھی ہوں گی' ماموں جان بھی ہوں گے' چچا' دادی' دادا بھی ہوں گے اور نانی نانا بھی ہوں گے" سیما خوش ہو کر بولی۔

"ہاں' وہاں سب لوگ ہوں گے اور وہ سب تمہیں بہت پیار کریں گے۔ تم بھی ان سے مل کر بہت خوش ہو گی۔"

"میں نے تو ان لوگوں کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں" سیما نے کہا۔

"تم یہیں پیدا ہوئی ہو۔ یہیں پلی بڑھی ہو۔ اب وہاں جاؤ گی تو ان سب سے ملو گی۔ اچھا' اب میں ذرا کام کرلوں۔ تم اتنی دیر میں اپنا ہوم ورک پورا کرلو" امی نے کہا اور باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

سیما نے اپنا بستہ اٹھایا اور اسکول کا کام کرنے لگی۔ وہ چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ اس کے امتحانات ہونے والے تھے۔ کام کرتے ہوئے وہ پھر سوچوں میں گم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر راول پنڈی جائے گی' جہاں رشتے داروں سے ملے گی۔ وہ نیا گھر

ہوگا۔ وہاں کے راستے اور سڑکیں بھی مختلف ہوں گی۔ وہاں نئے اسکول ہوں گے۔ وہاں نئی نئی لڑکیاں اس کی ہم جماعت ہوں گی۔ وہاں نئی نئی ٹیچر ہوں گی -- اسکول کی عمارت بھی نئی ہوگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جلدی سے پاکستان جا پہنچے۔

جب وہ سونے کے لئے لیٹی تو اس کے خیالوں نے خوابوں کا روپ دھار لیا۔ وہ ایک حسین سرزمین پر جا پہنچی جہاں بہت پیارے راستے تھے۔ بڑی صاف ستھری اور کشادہ گلیاں تھیں-- بہت اچھے گھر تھے-- خوب صورت دکانیں تھیں۔ اسکول کی عمارت تو بہت ہی شان دار تھی۔ وہاں بہت پیارے پیارے بچے اور بچیاں تھیں جو کلاسوں میں بیٹھی پڑھائی میں مصروف تھیں۔ اسکول کے برآمدوں اور باغ کی روشوں پر چلتے پھرتے اس نے اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے پھولوں کی کیاری کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک پودے کو غور سے دیکھا۔ سبز پتّوں کے ہجوم میں سُرخ رنگ کے بہت سے پھول کھلے ہوئے تھے۔

"ہمارے ملک میں اصلی گلاب ہوتا ہے" اسے اپنی امّی کے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔

"اصلی گلاب کیسا ہوتا ہے، امی؟" سیما نے پوچھا تھا۔

"اصلی گلاب میں بہت پیاری خوش بو ہوتی ہے جو دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں اِن پھولوں کے ہار بنائے جاتے ہیں، سہرے بنائے جاتے ہیں، گُل دستے بنائے جاتے ہیں۔"

"امی، ایک پھول توڑ کر دیکھوں؟" سیما نے پوچھا۔ اسے محسوس ہوا کہ امی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہیں۔

"اچھا، توڑ لو" امی نے اجازت دے دی۔

اس نے پھول توڑ کر سونگھا تو اس کا دل خوش ہوگیا۔ امریکا میں تو زیادہ تر ایسے پھول ہوتے ہیں جن میں خوش بو نہیں ہوتی۔

"سیما! سیما! اٹھ جاؤ--- صبح ہوگئی ہے" اچانک اس کے کانوں میں امی کی آواز آئی۔

"ابھی تو میں سیر کر رہی ہوں، اپنے پاکستان کی" سیما نے نیند بھری آواز میں جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے یہ خواب دیکھ رہی ہے" امّی نے ابّو سے کہا۔

سیما نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بستر پر لیٹی ہے۔

"کیا خواب دیکھ رہی تھیں، بیٹی؟" ابو نے پوچھا۔

"ابو، میں اپنے ملک کی سیر کر رہی تھی۔ معلوم ہے میرا پاکستان کتنا اچھا ہے؟ کتنا خوب صورت ہے؟ اس کی گلیاں اور سڑکیں کتنی صاف ستھری اور پیاری ہیں؟ اُف! کتنا شان دار ہے میرا ملک" اس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے ابو سے کہا۔

"ہاں، بیٹی۔ پاکستان ہمارا ملک ہے۔ اس کا ذرّہ ذرّہ ہمیں اپنی جان سے پیارا ہے" ابو نے کہا۔

"ابو، جلدی سے پاکستان چلئے" سیما نے بے چین ہو کر کہا۔

"ہاں، ہاں۔ چلیں گے۔ بس ضروری کام نمٹا لیں۔"

آخر ایک دن سیما اور اس کے والدین پاکستان آگئے۔ جہاز کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر سیما نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اسے خاکی رنگ کی یہ زمین بہت اچھی لگی۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ اس نے ایئرپورٹ پر رکھے ہوئے سرسبز پودوں کے گملے دیکھے۔ بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کا استقبال کرنے آئے ہوئے تھے۔ سیما کے چچا، خالہ اور ماموں بھی آئے تھے۔ اس نے سب کو مسکرا کر دیکھا۔ سب نے اسے پیار کیا اور خوش ہو کر ملے۔

"ارے واہ! سیما تو خوب بڑی ہوگئی ہے" خالہ نے ہنس کر کہا "میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم بہت چھوٹی سی ہوگی۔"

سیما مسکرا دی۔ ماموں کی بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر وہ لوگ گھر پہنچے۔ وہاں اور بھی بہت سے رشتے دار آئے ہوئے تھے۔ سیما نے دادا جان کا گھر دیکھا۔ اسے گھر میں رکھی ہوئی چیزیں، کرسیاں اور میزیں، کچھ مختلف سی لگیں۔

لیکن وہ جانتی تھی کہ پاکستان اور امریکا کے گھر اور ان کے سامان ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ سب لوگ محبت اور اپنائیت سے باتیں کر رہے تھے اور اردو زبان بولی جارہی تھی۔ یہ سب کچھ سیما کو بہت اچھا لگا۔ کچھ دیر بعد سب لوگوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے بھی بہت مزے دار تھے۔

ان لوگوں کا کمرا اوپر کی منزل پر تھا۔ سیما کھڑکی کے قریب کھڑی ہو کر باہر کا منظر دیکھنے لگی۔ "ارے! یہ کیا؟" اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے نیچے گلی تھی، ایک تنگ سی جگہ، جس میں بہت سے گھروں کے دروازے کھلتے تھے اور اس گلی میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

"امی! یہ کیا؟" اس نے گھبرا کر پوچھا "یہ اتنا سارا کوڑا کرکٹ؟ اتنا سارا گند؟"

امی اس کے قریب آئیں اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں "ہاں، یہاں لوگ کوڑا باہر پھینک دیتے ہیں" امی نے اسے بتایا۔ امریکا میں وہ لوگ ایک پلاسٹک بیگ میں کوڑا بھر کر گھر کے باہر رکھ دیتے تھے اور وہاں سے اسے اٹھالیا جاتا تھا۔

"امی، یہ لوگ اپنے گھر کے باہر کوڑا کیوں پھینکتے ہیں؟ دیکھئے ناں، کس قدر گندگی ہو گئی ہے --- اور اس کوڑے میں پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے بھی ہیں۔ کاغذوں کے ڈھیر بھی ہیں--- ان میں کتنے جراثیم ہوں گے۔ دیکھئے، کتنی مکھیاں بِھنک رہی ہیں۔ کیا لوگوں کو پتا نہیں کہ اس سے کتنا نقصان ہوتا ہے؟ کیا ان لوگوں کو کسی نے نہیں بتایا کہ اپنے پیارے ملک کو، اس کے شہروں کو، اس کے گلی کوچوں کو صاف ستھرا رکھنا چاہئے؟" وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے امریکا میں اتنی گندگی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی امی خاموش تھیں۔

"امی، آپ بولتی کیوں نہیں؟ یہ لوگ اپنے ملک کو، اپنے پیارے وطن کو صاف ستھرا کیوں نہیں رکھتے؟"

اتنی دیر میں ایک گھر کا دروازہ کھلا اور کسی عورت نے مالٹوں کے بہت سارے چھلکے باہر پھینک کر دروازہ بند کرلیا۔ سیما اور اس کی امی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ "اس نے ایسا کیوں کیا، امی؟" سیما نے بے چین ہو کر پوچھا۔

سیما کی امی جانتی تھیں کہ گھروں کے باہر، گلیوں میں، سڑکوں پر، کوڑا کرکٹ پھینکنا یہاں کے لوگوں کی عادت ہے۔ یہ ایک عام بات ہے۔ لیکن وہ سیما کو یہ بتاتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہی تھیں۔ اس لئے وہ خاموش رہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ سیما کے چہرے پر الجھن تھی۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"تم اس بات کا اتنا اثر نہ لو۔ چلو، اب آرام کرو" امی نے کہا

اگلے دن وہ لوگ نانی جان کے گھر گئے۔ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی اور اس پر جگہ جگہ کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ کسی بچے نے ان کے قریب چلتے ہوئے چاکلیٹ کھائی اور اس کا ریپر توڑ مروڑ کے سڑک پر پھینک دیا۔ وہ مُڑا تُڑا سا ریپر سیما کے پاؤں کے قریب آکر گرا۔ سیما کو سخت غصہ آیا۔ اس نے لپک کر اس بچے کو پکڑلیا "اے لڑکے! تم نے یہ کاغذ یہاں کیوں پھینکا؟"

"پھینک دیا بس۔ تم کون ہو پوچھنے والی؟" لڑکے نے تڑخ کر جواب دیا۔

"یہ میرا ملک ہے۔ یہ میری سڑکیں ہیں۔ ان پر گندگی کیوں پھیلاتے ہو؟"

"میری مرضی۔ میں جو چاہوں کروں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

لڑکا یہ جواب دے کر جلدی سے بھاگ گیا۔ سیما کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے خود نیچے جھک کر کاغذ اٹھالیا۔ وہ دور تک چلتی چلی گئی لیکن کوئی کوڑے دان نظر نہ آیا جس میں وہ کوڑا پھینک دیتی۔

"امی، یہاں کوڑے دان کیوں نہیں ہوتے؟" سیما نے پوچھا۔ اسے یاد آیا کہ امریکا میں گلیاں اور سڑکیں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے باغوں، پارکوں اور تفریحی مقامات پر صبح سے شام تک لوگوں کا ہجوم رہتا ہے لیکن ذرا سا بھی کوڑا نظر نہیں آتا۔ جگہ جگہ کوڑے دان ہوتے

ہیں اور لوگ ان کے اندر کوڑا ڈالتے ہیں۔

کچھ دور چلنے کے بعد، سڑک کے ایک جانب ایک کوڑے کا ڈبا نظر آیا۔ لیکن اس کے افسوس کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ کوڑا اس ڈبے کے باہر پڑا تھا اور کوڑے کا ڈبا تقریباً خالی تھا۔

"امی، یہاں تو لوگوں کو صفائی کا احساس تک نہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے!" سیما نے کہا۔

"شاید ابھی ہم لوگ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے اندر شعور کی کمی ہے، تعلیم کی کمی ہے" امی نے کہا۔

سیما کو اس نئے ماحول میں بہت مشکل ہو رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے غصے کا اظہار کرتی اور لوگوں کو برا بھلا کہتی۔ امی اور ابو اسے سمجھاتے لیکن اس کا غصّہ کم نہ ہوتا۔ امی پاکستان کی تعریفیں کرتیں۔ اسے بتاتیں کہ یہاں کے پھول پودے خوب صورت ہیں اور یہاں کی سبزیاں اور پھل بہت لذیذ ہیں۔ یہاں کے موسم بہت حسین ہیں۔ یہاں کے سب لوگ اپنے ہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ جب کہ امریکا کے لوگوں سے ہمارا ایسا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن سیما مطمئن نہ ہوتی۔

جب وہ لوگ گھومنے پھرنے کے لئے نکلے تو سیما کو معلوم ہوا کہ شہر میں بہت سے ایسے علاقے ہیں جہاں کچے مکانات ہیں۔ بہت سے گاؤں ایسے بھی تھے جہاں بجلی نہیں تھی، پانی نہیں تھا، جلانے والی گیس نہیں تھی۔ بہت سے بچوں کو اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ یہ سب باتیں بہت تکلیف دہ تھیں۔ سیما تو ایک صاف ستھرے چاند جیسے چمکتے دمکتے ملک کا تصوّر لے کر آئی تھی۔ لیکن اس چاند میں تو بہت سارے داغ دھبّے تھے۔ وہ اتنی مایوس ہوئی کہ اس نے اپنے والدین کو اپنا فیصلہ سنادیا کہ وہ واپس امریکا جانا چاہتی ہے۔ وہ یہاں بالکل نہیں رہ سکتی۔

امی اس کا فیصلہ سن کر پریشان ہوگئیں۔ "اب کیا ہوگا؟" انہوں نے سیما کے ابّو سے پوچھا۔

"اسے سمجھاؤ --- مان جائے گی" ابو نے کہا۔

"ہم تمہیں یہاں اچھے سے اسکول میں داخل کرائیں گے" خالہ نے سمجھایا۔

"یہاں کے سب اسکول گندے ہیں۔ یہاں کے سب بچے گندے ہیں" سیما نے کہا۔

"ہم مری جائیں گے، کراچی کی سیر کریں گے، لاہور جائیں گے" امی بولیں۔

"مجھے کہیں نہیں جانا۔ بس میں امریکا جاؤں گی۔ میں

وہیں رہوں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی" اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔

چچا نے اسے سمجھایا "اپنے ملک میں انسان عزّت سے رہتا ہے۔ آزادی سے رہتا ہے۔ دوسرے ملک میں ہم لوگوں کو دوسرے تیسرے درجے کا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہمارا اپنا ہے۔ یہاں سب لوگ ہمارے اپنے ہیں۔"

امی اس کی ضد سے تنگ آچکی تھیں۔ انہوں نے سیما کے نانا سے اس بات کا ذکر کیا "کچھ آپ ہی اسے سمجھایئے۔ ہم لوگ تو سمجھا سمجھا کر ہار گئے۔"

"سیما، بیٹی، امریکا کے لوگ کتنے اچھے ہیں۔ تمہاری زبان بولتے ہیں ناں؟" نانا ابو نے کہا۔

"نہیں۔ وہ لوگ ہماری زبان نہیں بولتے۔ وہاں تو سب لوگ انگلش بولتے ہیں۔ ہمیں وہاں ان کی زبان میں بات کرنا پڑتی ہے"۔

"وہاں کے لوگ ہمارے جیسے کھانے پکاتے ہیں؟" نانا ابو نے کہا۔

"نہیں۔ وہ لوگ دوسری طرح کے کھانے پکاتے ہیں۔ وہ پلاؤ زردہ، قورمہ بریانی نہیں پکاتے۔"

"اچھا وہ لوگ ہمارے جیسے کپڑے پہنتے ہیں؟" نانا ابو نے پوچھا۔

"مرد تو پتلون اور بش شرٹ پہنتے ہیں، عورتیں اسکرٹ یا جینز پہنتی ہیں" سیما نے کہا۔

"امریکا کے لوگ تم لوگوں کو امریکی کہتے ہیں ناں؟" نانا ابو نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ ہمیں ایشیائی کہتے ہیں۔ ہم امریکی تھوڑی ہیں" سیما بولی۔

"بیٹی، امریکا میں امریکی رہتے ہیں تو پاکستان میں پاکستانی کیوں نہ رہیں؟ تم لوگ پاکستانی ہو تو تمہیں پاکستان میں ہی رہنا چاہیے۔ تم ذہین بچی ہو۔ خوب سارا پڑھو لکھو۔ اس ملک کی بہتری کے لئے کام کرو۔ اس کو خوش حال بناؤ۔ یہاں سے جہالت کے اندھیرے دور کرو۔ اس ملک کی تعمیر میں حصّہ لو۔ یہاں کے لوگوں کی مشکلیں حل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ لوگ جن اچھی باتوں کو نہیں جانتے، تم انہیں سمجھاؤ۔ دراصل ہمارا ملک ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا ہے۔ ہم ابھی پس ماندہ لوگ ہیں۔ لیکن اِن شاء اللہ وہ دن جلد آئے گا جب ہمارا پاکستان بہت ترقی یافتہ ہو جائے گا۔ یہاں سب لوگ پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ ہوں گے۔ یہاں ہر طرف خوش حالی ہوگی۔ ہماری گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر نہیں ہوں گے۔ اگر تم اس ملک کو چھوڑ کر باہر چلی جاؤ گی تو پھر کون اس ملک کی بھلائی اور ترقی کے کام کرے گا؟ یہ اچھی بات ہے کہ تم سڑکوں اور گلیوں میں کوڑا بکھیرنا پسند نہیں کرتیں۔ یہ بات تم اوروں کو بھی بتاؤ۔"

"میں اکیلی بھلا کیا کر سکتی ہوں، نانا ابو؟" سیما نے پوچھا۔

"قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے، بیٹی۔ ہمیں ہمّت نہیں ہارنی چاہیے۔ ہم سب اپنی ذمّے داریوں کو پورا کریں اور ملک میں اچھائیاں اور نیکیاں پھیلائیں تو ہمیں دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اچھے کام کریں گے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔"

"اور اگر میں باہر چلی گئی تو؟" سیما نے آہستہ سے پوچھا۔

"یہ تو فرار کا راستہ ہے۔ یہ تو ہار ماننے کے برابر ہے۔ تم اگر اس ملک سے مَحبّت کرتی ہو تو تمہاری ذمّے داری ہے کہ اسے اچھا بنانے کے لئے کام کرو۔ خوب محنت کرو۔ خلوص سے، محبت سے، لگن سے کام کرتی رہو۔ یہ قوم ایک نہ ایک دن ضرور اچھی عادتیں اپنالے گی۔ اس کا مجھے یقین ہے" نانا ابو نے کہا۔

"ٹھیک ہے، نانا ابو۔ میں یہیں رہوں گی اور پاکستان کی بھلائی اور ترقی کے لئے کام کروں گی" سیما نے کہا۔ نانا ابو نے اسے پیار کیا اور امی اور ابو مسکرانے لگے۔ سیما کے دل میں وطن کی محبت کا دیا روشن ہو گیا تھا!

حنا خیری

بلّیوں والی خالہ

یہ پہلا موقع تھا کہ میں اور کلیم ماموں جان کے گاؤں 'رحمت نگر' جارہے تھے۔ ماموں کے تین بچے تھے: فرحت آپی، مُنعم اور رانی۔ منعم میرے برابر تھا۔ فرحت آپی ہم سے کافی بڑی اور رانی صرف پانچ سال کی تھی۔ میں کلیم سے بڑا تھا اور منعم اور ہم دونوں میں بہت دوستی تھی۔ اس سے پہلے ہمیشہ ماموں جان ہی ہمارے پاس کراچی آیا کرتے تھے۔ مگر اس مرتبہ ہم وہاں جارہے تھے۔ اس خیال ہی سے ہم دونوں خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے۔

ہم گاؤں پہنچے تو وہاں کی خوش گوار اور صاف ستھری فضا ہمیں بہت بھائی۔ رحمت نگر خاصا بڑا گاؤں تھا۔ بلکہ گاؤں کیا اسے تو قصبہ کہنا چاہئے۔ یہاں ہر گھر میں بجلی تھی اور لوگوں کو ضرورت کی ہر چیز مُیسّر تھی۔

اسلم اور راشد منعم کے گہرے دوست تھے۔ ہماری بھی ان سے خوب دوستی ہوگئی۔ ہم لوگ کرکٹ اور گلّی ڈنڈا کھیلنے کے علاوہ کھیتوں' میں گھوما کرتے اور قدرت کے خوب صورت مناظر کا لطف اٹھاتے۔ تروتازہ ہوا میں سانس لیتے تو لگتا تازگی ہمارے اندر اترتی جارہی ہے۔

گاؤں کے قریب دور دور تک پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک دن ہم لوگ پھرتے پھراتے اس طرف جا نکلے۔ یہاں گھنے درختوں میں گھرے ایک چھوٹے سے مکان کو دیکھ کر میں نے حیرت سے کہا "ارے! یہاں کون رہتا ہے؟"

"اس گھر میں ایک بڑی عجیب اور پُراَسرار سی عورت رہتی ہے" منعم بولا "کسی سے ملتی جلتی نہیں ہے۔ گاؤں میں سودا سلف لینے آتی ہے تو دکھائی دیتی ہے۔ سب لوگ اس سے دور دور رہتے ہیں۔"

"کیوں؟ ایسی کیا بات ہے اس میں؟" کلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ خود کسی سے نہیں ملتی، اس لئے لوگوں نے بھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ اور پھر اس کا رویّہ بھی عجیب وغریب اور پُراَسرار ہے۔ جب بھی گاؤں میں کسی کام سے آتی ہے، اس کے ساتھ کئی بلّیاں ضرور ہوتی ہیں...

گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ شاید وہ کوئی جادوگرنی ہے" منعم بولا۔

"واقعی' ہے تو بڑی عجیب سی بات" میں نے کہا "ایک تنہا عورت' آبادی سے دور رہے' کسی سے ملے جلے بھی نہیں۔ کہیں واقعی وہ جادوگرنی تو نہیں؟"

"جادوگرنی ہے یا نہیں' یہ تو پتا نہیں۔ لیکن وہ ہے بہت پُراسرار" راشد بولا "میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے۔ کیوں نہ ہم لوگ اس کے گھر میں گھس کے دیکھیں کہ آخر وہ کرتی کیا ہے۔"

"خیال تو بڑا اچھا ہے" منعم خوش ہو کے بولا "مگر گھر میں گھسیں گے کب اور کیسے؟ اور اگر وہ واقعی جادوگرنی ہوئی تو؟"

"تو کیا ہوگا؟" اسلم ہنس کے بولا" زیادہ سے زیادہ ہمیں چوہا بنادے گی۔"

طے پایا کہ شام ڈھلے اس پُراسرار عورت کے گھر میں داخل ہوا جائے۔ راشد کو کوئی کام تھا۔ وہ نہیں آیا۔ اس لئے میں' منعم اور اسلم اکٹھے نکلے۔ کلیم کو ہم نے خود ہی نہیں لیا تھا کیوں کہ وہ ذرا ڈرپوک واقع ہوا ہے۔ ہمیں ڈر تھا کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگاڑ دے۔ اندر پہنچنا کچھ ایسا مشکل ثابت نہ ہوا۔ ہم لوگ ایک ایسے کمرے میں پہنچے جسے بیٹھک یا ڈرائنگ روم کہنا چاہئے۔ اس کمرے میں صوفے' میزیں اور کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں پر تصویریں ٹنگی تھیں۔ گاؤں کے امیر لوگوں کے مکان بھی ایسے سجے ہوئے نہیں تھے جیسا کہ یہ مکان تھا۔

ہمارے سامنے تین چار بلیاں صوفوں اور کرسیوں پر ٹانگیں پسارے لیٹی تھیں۔ چند ایک زمین پہ دراز تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہماری آہٹ پر آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھا تھا اور پھر ہلکی سی میاؤں کر کے آنکھیں مُوندلی تھیں۔ ہم ایک بڑے سے صوفے کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ چند منٹ بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک عورت' جو کافی موٹی تھی' اندر داخل ہوئی۔

منعم نے مجھے کہنی مار کر اشارے سے بتایا کہ یہی وہ عورت ہے۔ میں حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔ دیکھنے میں تو وہ کوئی عام سی عورت لگتی تھی' ایسی ہی جیسی ہماری امّیاں اور آنٹیاں ہوتی ہیں۔ جب کہ میں نے تو اپنے ذہن میں اس کا ایک عجیب اور پُراسرار سا خاکہ بنایا تھا جو کچھ کچھ ہنسل اور گریٹل کی کہانی کی جادوگرنی کی طرح تھا۔ دبلا پتلا کمزور جسم' کھچڑی بال' بہت لمبی اور مُڑی ہوئی ناک۔ لیکن یہ عورت تو کسی طرف سے بھی جادوگرنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی آواز لگائی "آجاؤ' بچو!" اور پھر زور سے سیٹی بجائی۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کہاں سے ڈھیر ساری' طرح طرح کی' بلیاں دوڑتی بھاگتی' اچھلتی کودتی' وہاں آگئیں۔ میرا اندازہ ہے کم از کم درجن بھر تو ضرور ہوں گی۔

اتنی ساری بلیاں دیکھ کر میرا تو حلق خشک ہونے لگا۔ اس عورت کو ہماری موجودگی کا علم ہو جاتا اور وہ اپنی بلیوں کو اشارہ کر دیتی تو وہ ہماری تکّا بوٹی کر دیتیں۔ خیر' وہ ان سب بلّیوں کو برابر کے کمرے میں لے گئی اور انہیں ان کے پیالوں میں کھانا دینے لگی۔ ساتھ ہی انہیں چمکارتی اور باتیں بھی کرتی جاتی۔

تھوڑی دیر اور ہم وہاں دبکے رہے' اس کے بعد چپکے سے باہر نکل گئے۔ ہمارے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ ہم تو یہ امید کر رہے تھے کہ کوئی ناقابلِ یقین بات دیکھ کر آئیں گے' مگر وہ تو ایک عام سا گھر تھا اور اس عورت میں سوائے اس کے اور کوئی خاص بات نظر نہیں آئی کہ اس نے بلّیوں کی ایک پوری فوج جمع کر رکھی تھی۔

دو تین روز بعد کا ذکر ہے' میں کلیم، منعم اور راشد پکنک منانے پہاڑیوں کی طرف گئے۔ پہاڑی پر چڑھ کر ہمیں بہت لطف آیا۔ ہم ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اوپر پہنچ کر ہم نے ذرا آرام کیا اور پھر مزے دار چٹ پٹے سموسے' پکوڑے اور گلگلے اڑانے لگے۔ واپسی میں آدھا راستہ طے کیا تھا کہ کلیم کی چیخ فضا

میں گونجی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس کے سر اور ہاتھوں پاؤں پر اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ ہم نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر بے سُود۔

"اب کیا کریں؟" میرا پریشانی کے مارے بُرا حال تھا۔

"چلو' اسے اٹھا کر لے چلتے ہیں" راشد نے مشورہ دیا "اسے ہوش آبھی گیا تو بھی خود تو چل کر جا نہیں سکتا"۔

ہم تینوں نے اسے ہاتھ اور پیر پکڑ کر اٹھالیا۔ تھوڑا راستہ طے کیا ہوگا کہ اُس پُراسرار عورت کا وہ مکان دکھائی دیا جہاں ہم دو تین روز پہلے جاسوسی کی غرض سے گئے تھے۔ اس کی پرانے ماڈل کی کار مکان کے باہر کھڑی تھی اور وہ خود اس میں سے نکل رہی تھی۔ شاید کہیں سے واپس آئی تھی۔ اس نے جو ہمیں اس طرح آتے دیکھا تو آواز دے کر پوچھا "کیا ہوا؟"

"میرا بھائی پہاڑی سے گر گیا ہے۔ کافی چوٹیں آئی ہیں۔ بے ہوش ہے" میں نے کہا۔

"آؤ' میں تم لوگوں کو ہسپتال پہنچا دوں" اس عورت نے کہا۔ ہم اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ہسپتال میں کلیم کی مرہم پٹی کی گئی اور تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آگیا۔ اس سارے عرصے میں وہ عورت ہمارے ساتھ کھڑی رہی۔ اس کے بعد اس نے ہمیں گھر چھوڑ دیا۔ ہم نے اخلاقاً چائے کی دعوت دی مگر وہ "پھر کبھی سہی" کہ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

کئی روز گزر گئے تھے۔ کلیم کے زخم اب کافی حد تک بھر چکے تھے۔ ممانی جان نے ہم سے کئی مرتبہ کہا کہ ہم اس عورت کے گھر جا کر اس کا شکریہ ادا کریں۔ ہم خود بھی جانا چاہتے تھے۔ آخر ایک دن میں' منعم اور کلیم اس کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹ کھٹانے پر وہ باہر آئی اور ہمیں دیکھ کر بولی "اوہو! تم لوگ ہو۔ کہو' کیسے آئے؟ اور میاں' تمہارا کیا حال ہے؟"

"جی' اب تو بالکل ٹھیک ہوں" کلیم نے جواب دیا۔

منعم نے پھلوں کی ٹوکری اس عورت کے ہاتھوں میں پکڑاتے ہوئے کہا "یہ میری امی نے بھیجے ہیں۔ وہ کہ رہی تھیں کہ میں خود بھی کبھی آؤں گی' آپ کا شکریہ ادا کرنے۔"

"ارے' اس کی کیا ضرورت تھی" وہ بولی "آؤ اندر تو آؤ۔ چائے وائے پیو۔"

"آپ کو تکلیف ہوگی۔ رہنے دیں" میں نے کہا۔

"تکلیف کیسی؟ تم تو اتنے پیارے بچے ہو۔ مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے' جہاں کچھ ہی روز پہلے جاسوسی کی غرض سے چھپے ہوئے تھے۔ دو چار بلیاں یہاں بیٹھی ہوئی تھیں اور کچھ ہمیں راستے میں دکھائی دی تھیں۔

چائے کے ساتھ بسکٹ' حلوا اور کیک تھا۔ ہم لوگ ان مزے دار چیزوں پر پل پڑے۔ لڑکے ویسے بھی کھانے پینے کے معاملے میں ذرا بے تکلّف ہوتے ہیں اور ہر گھر کو اپنا گھر سمجھ کر خوب کھاتے پیتے ہیں۔ میں نے اپنا اور کلیم کا تعارُف کرایا اور منعم اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں بتانے لگا۔

"آپ کو بلیاں پالنے کا بہت شوق ہے" کلیم نے کہا۔

وہ بولی "ہاں' بیٹے۔ یہ بلیاں ہی میری ساتھی اور دوست ہیں" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی "میں جانتی ہوں کہ لوگ مجھے بڑا عجیب اور پُراسرار سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ شاید سمجھتے ہیں کہ میں جادو وغیرہ کرتی ہوں۔"

"آپ کو معلوم ہے؟" منعم حیرت سے بولا۔

"ہاں' ایسی باتیں پتا چل ہی جاتی ہیں۔ لوگ میرے منہ پر تو کچھ نہیں کہتے' مگر میرے پیٹھ پیچھے کہانیاں بناتے ہیں۔"

ہم سب چور بنے بیٹھے تھے' کیوں کہ ہم بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔

"لیکن' آنٹی۔ آپ کسی سے ملتی بھی تو نہیں۔ لوگوں

سے ملیں جُلیں گی تو یہ ساری باتیں خودبخود ختم ہو جائیں گی" منعم جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"پتا نہیں لوگ مجھ سے کیوں کتراتے ہیں" اس نے افسردگی سے کہا" شاید وہ میرے بلّیاں پالنے کے شوق کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن یہ بلّیاں تو میری تنہائی کی ساتھی ہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہی ہوئے ہیں۔ ایک حادثے میں میرا شوہر اور بیٹا مجھ سے بچھڑ گئے۔ تب مُجھ سے شہر میں رہا نہ گیا اور میں اپنا سب کچھ بیچ کر اس چھوٹی سی پُرسکون جگہ آگئی۔ میرے بیٹے کو بلیاں بہت پسند تھیں۔ بس، میں نے انہیں اپنی تنہائی کا ساتھی بنا لیا۔ ان کے ساتھ میرا وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے"... یہ کہ کے وہ ہلکے سے ہنسی۔ اس کی ہنسی میں اُداسی گھلی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک دم چپ اور اُداس ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہو رہا تھا کہ ہم نے اسے کتنا غلط سمجھا تھا۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟" کلیم نے کہا۔

ہاں، ہاں ضرور" اس نے کہا۔

"ہم آپ کو بلیّوں والی خالہ کہہ سکتے ہیں؟"

"بلیّوں والی خالہ!" وہ ایک دم ہنس پڑی "بھئی واہ! کیا نام ہے! چلو، تم میرا یہی نام رکھ لو۔" یوں اس کا نام بلیوں والی خالہ پڑ گیا۔

جاتے وقت ہم بلیوں والی خالہ کو کھانے کی دعوت دینا نہ بھولے تھے، جو ممانی جان کی طرف سے تھی۔ بلیوں والی خالہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور آئیں گی۔

آپ جانتے ہیں؟

- 1918ء میں دنیا میں فلو کی جو ہولناک وبا پھیلی تھی، اس میں تقریباً 2 کروڑ انسان مر گئے تھے۔ صرف امریکا میں 5 لاکھ لوگ ہلاک ہوئے تھے۔
- یورپ کے ایک دندان ساز نے ایک دفعہ ایک دانت میں صنوبر کا ننھّا سا پودا اُگایا تھا۔
- سانپ کی آنکھوں کے پپوٹے نہیں ہوتے۔
- اب تک، دنیا کے مختلف مقامات پر، 31 مختلف شکلوں کی اُڑن طشتریاں دیکھی جا چکی ہیں۔
- ایک درجن جگنو اتنی روشنی پیدا کرتے ہیں کہ آپ اس روشنی میں کتاب پڑھ سکتے ہیں۔
- بندر جگنو کے قریب نہیں جاتے۔ وہ اسے آگ کا شُعلہ سمجھتے ہیں۔
- کھبّا (Left-Handed) شخص کپڑے پہنتے وقت پہلے بائیں ٹانگ شلوار (یا پتلون) میں ڈالتا ہے۔
- امریکا کے صدر روز ویلٹ کے پاس ایک ایسی دوات تھی جو گینڈے کے پاؤں کو کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی۔
- زرافے ایک دوسرے کی گردن پر گردن رگڑ کر محبت کا اظہار کرتے ہیں۔
- بڑے سمندر (بحر) میں پانی کا دباؤ اتنا شدید ہوتا ہے کہ آپ بحری جہاز میں سے شیشے کی بوتل نیچے پھینکیں تو وہ سمندر کی تہ میں جانے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گی۔
- چاندی، زیادہ تر، فوٹو گرافی اور آئینے بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔
- مصر کے ایک بادشاہ، محمد علی، کی فوج میں دو کمپنیاں ایسی تھیں جس کے تمام سپاہی کانے تھے (ایک کمپنی میں 100 سپاہی ہوتے ہیں)۔
- پُرانے زمانے کے لوہار لوگوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیاں بھی جوڑتے تھے۔
- آئس کریم 1620ء میں ایجاد ہوئی تھی۔
- ترکی کے شہر استنبول میں 450 مسجدیں ہیں۔

دِل چسپ اور عجیب

☆ فرانس کے چھ بادشاہوں کا نام "چارلس" تھا۔ عوام نے پہچان کے لئے اُن کے نام کے آگے مختلف اَلقاب لگا رکھے تھے، اور وہ اُنہیں چارلس بھولا، چارلس لنگڑا، چارلس نِکمّا، چارلس گنجا، چارلس موٹا اور چارلس پگلا کہتے تھے۔

☆ چینی چائے کو "چا" کہتے ہیں۔ پنجابی زبان میں بھی چا ہی کہا جاتا ہے۔ اُردو والوں نے چا کے آگے "ئے" لگا کر چائے بنالیا۔ ہالینڈ کے لوگ چائے کو "تھی" اور ملایا کے لوگ "ٹیہ" کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ ٹی (Tea) اِنہی لفظوں (تھی اور ٹیہ) سے بنا ہے۔

☆ مِصر کے ایک بادشاہ (فرعون) نے 12,000 آدمی صِرف اپنی پالتو بِلّیوں اور کتّوں کی دیکھ بھال کے لئے ملازم رکھے تھے۔

☆ انگلینڈ کے ایک بادشاہ کو پیسوں کی ضرورت ہوئی تو اُس نے مکانوں کی کھڑکیوں پر ٹیکس لگا دیا۔ لوگوں نے ٹیکس سے بچنے کے لئے اپنے مکانوں کی کھڑکیوں میں اِینٹیں چُنوا دیں۔

☆ صحرائے اعظم میں ریت کا ایک ٹیلا 1410 فٹ اُونچا ہے۔ (امریکا کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ سے بھی زیادہ اُونچا)

☆ مُتّحِدہ عرب اِمارات میں 61 فی صد مرد اور 39 فی صد عورتیں ہیں۔ اِس کے برعکس موناکو میں 55 فی صد عورتیں اور 45 فی صد مرد ہیں۔ پاکستان میں 51 فی صد عورتیں اور 49 فی صد مرد ہیں۔

☆ امریکا کا ایک صدر، وِلیم ہاورڈ ٹافٹ، بہُت موٹا تھا۔ ایک دن وہ نہانے کے لئے ٹب میں بیٹھا تو اُس میں پھنس گیا۔ نوکروں نے ٹب توڑ کر اُسے نکالا۔

☆ ایک انگریز خاتون، مِسز ہارڈن، اپنے سر کے بالوں کو سات حِصّوں میں تقسیم کرتی تھی، اور پھر اُنہیں سات مختلف رنگوں سے رنگتی تھی۔ لوگ اُسے "دھنک بیگم" کہتے تھے۔

☆ فرانس کا مشہور سائنس دان، لُوئی پاسچر، جس نے پاگل کتّے کے کاٹے کا ٹیکا اِیجاد کیا تھا، جراثیم سے بہُت ڈرتا تھا۔ وہ ہر دس پندرہ منٹ بعد ہاتھ دھوتا تھا اور کسی سے، چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، مُصافحہ نہیں کرتا تھا۔ (س۔ل)

****

اُستاد (شاگرد سے) : ہمارے جِسم میں کتنی ہڈّیاں ہیں؟
شاگرد : جناب، 207
اُستاد : نہیں بیٹے 206
شاگرد : جناب، آج کھانا کھاتے ہوئے ایک ہڈّی میرے پیٹ میں چلی گئی تھی۔ (یسریٰ مقبول، لالہ زار کالونی ڈیرہ اسماعیل خان)

ایک نرس مریض کو بے ہوش کرنا چاہتی تھی، مگر کلوروفارم ختم ہوچکا تھا۔ ایک لڑکا پاس کھڑا تھا۔ اُس نے کہا "سِسٹر، اِسے میری جُراب سُنگھا دیں۔"
نرس بولی : اِسے بے ہوش کرنا ہے، مارنا نہیں۔
(فِدا محمّد ہاشمی، گلن خیل)

ایک جگہ دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ دونوں ڈرائیور لڑنے لگے۔ ایک بولا "قصور تمہارا ہے۔ تم نے مُڑتے ہُوئے ہاتھ نہیں دیا۔"
دوسرا ڈرائیور غُصّے سے کہنے لگا "اِتنی بڑی کار تو تمہیں نظر نہیں آئی، ہاتھ کیا نظر آتا؟"
(جاوید عبدُالکریم، کراچی)

ایک آدمی اپنے گھر میں بیٹھا گانا گارہا تھا۔ اُس کی بیوی بولی "میرے والد صاحب جب گانا گاتے تھے تو اُڑتے ہوئے پرندے گر پڑتے تھے۔"

شوہر نے کہا "کیا آپ کے ابّا حضور مُنہ میں کارتوس ڈال کر گانا گاتے تھے؟" (ارشد عزیز، طارق عزیز، خاص دیر)

ایک سیاسی لیڈر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت مغرور اور بد دماغ آدمی ہے۔ ایک دفعہ وہ ایک جلسے میں تقریر کررہا تھا۔ اُس نے کہا "میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں بہت مغرور اور بد دماغ ہوں۔ اگر میں مغرور اور بد دماغ ہوتا تو کیا تم جیسے دو ٹکے کے لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے آتا؟" (فضل بادشاہ، پشتون گڑھی نوشہرہ)

ایک شخص اپنے دوست کے گھر آیا اور اُس کی بیوی سے پُوچھا "بھابی، حامد کہاں ہے؟" بیوی بولی "اُن کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔"

اُس شخص نے پُوچھا "ایکسی ڈنٹ کیسے ہُوا تھا؟"

بیوی نے جواب دیا "میں نے اُنہیں سُرخ مرچیں لانے کو بھیجا تھا کہ اُن کی موٹر سائیکل ایک ٹرک سے ٹکراگئی۔"

اُس شخص نے پُوچھا "پھر آپ نے کیا کیا؟"

بیوی بولی "کرنا کیا تھا۔ میں نے ہنڈیا میں سبز مرچیں ڈال دیں۔" (وسیم مقصود کاشمیری، شاد باغ لاہور)

صاحب : خان ساماں، تم نے ہماری نوکری تو چھوڑ دی ہے۔ لیکن تمہیں ہم جیسا مالک کہیں نہیں ملے گا۔ تم ہمیشہ ہمیں یاد رکھو گے۔

خان ساماں : حضُور، آپ سے زیادہ تو مجھے آپ کا کُتا ٹامی یاد آئے گا۔ تمام برتن وُہی صاف کیا کرتا تھا۔ (فریحہ، گجرات)

اِسکول کے ایک اُستاد اپنے کسی شاگرد کے مضمون کے یہ جُملے مزے لے لے کر سُناتے تھے۔

"امریکی صدر ابراہام لنکن ایک سادہ مزاج آدمی تھا۔ وہ لکڑی کے ایک کیبن میں پیدا ہوا تھا، جو اُس نے خود بنایا تھا۔ (فدا محمّد ہاشمی، گلن خیل)

ایک سِکھ کے دوست نے اُس کی ڈاڑھی میں مٹر کا دانہ پھنسا دیکھ کر کہا "آج تم نے مٹر پلاؤ کھایا ہے۔"

سِکھ نے جواب دیا "نہیں۔ وہ تو میں نے پچھلے ہفتے کھایا تھا۔ (عائشہ خان مندوخیل، کوئٹہ چھاؤنی)

ایک مسافر ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا نام پتا لکھ رہا تھا کہ ایک مچھّر اُس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں اُس کے کمرے کا نمبر لکھا ہُوا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس نے مینجر سے کہا:

"صاحب، میں نے اب تک کئی ہوٹلوں میں مچھر دیکھے ہیں۔ لیکن اِس ہوٹل کے مچھّر تو بڑے ہی ہوشیار ہیں۔ وہ خود آکر رجسٹر میں دیکھ لیتے ہیں کہ کون سا مسافر کس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے۔" (شیر نواز گل، ارمڑ پایان)

آپ بھی لکھیے

اِحترام

سامیہ شازی سیٹلائیٹ ٹاؤن راول پنڈی

ہمارے گھر میں بڑے بوڑھوں سے لے کر چھوٹوں تک کی عزّت کی جاتی ہے اور ہمیں تمام چھوٹے بڑوں کو "آپ" کہہ کر مُخاطَب کرنے کا حکم ہے۔ ہمارے دادا، نانا، دادی، نانی میں سے صرف دادی جان ہی زندہ ہیں، باقی سب بُزرگ اِنتقال فرما چکے ہیں۔ ہماری دادی امّاں کی سب خاندان والے عزّت کرتے ہیں۔ اُن کو امّاں جی کہتے ہیں کیوں کہ یہ اَلفاظ اِس رشتے کی پوری مٹھاس لئے ہوئے ہیں۔

ہماری امّاں جی کو پیاس بہت لگتی ہے۔ جو کوئی بھی اُن کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے، فوراً اُس سے پانی لانے کو کہتی ہیں۔ ایک مرتبہ بڑی آپا سے اُنہوں نے تیسری بار پانی مانگا تو وہ جُھنجلا کر بولیں "کیا مصیبت ہے!" امّی نے اُن کی یہ بات سُن لی اور اُنہیں تنبیہہ کی کہ آیندہ وہ اِس قسم کی بات نہ کریں۔ وہ دن اور آج کا دن، آپا نے پھر کبھی اماں جی کی کسی بات پر جُھنجلاہٹ کا اِظہار نہیں کیا۔ امّی کی ایک بار کی نصیحت ہی کافی تھی۔ بُزرگوں کا اِحترام ہم سب پر لازم ہے، کیوں کہ یہ ہمارے پیارے نبی ؐ کا اِرشاد ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو بزرگوں کی عزّت نہیں کرتے اور اُن کی باتوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

ایک دن میں اپنی ایک سہیلی رافِعہ کے گھر گئی۔ اُس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ کچھ دیر وہ میرے ساتھ باتیں کرتی رہی اور پھر "ایک منٹ۔ ابھی آئی" کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اکیلی بیٹھی ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی کہ اچانک دروازہ کُھلا۔ میرا خیال تھا کہ رافِعہ ہوگی، لیکن دروازے سے ایک بہت ہی بُزرگ خاتون اندر داخِل ہوئیں۔ اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ میں اَدب سے کھڑی ہوگئی اور اُنہیں سلام کیا۔ اُن بزرگ خاتون نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا، سلام کا جواب دیا اور پھر مجھے بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔ میں اُس وقت تک ادب سے کھڑی رہی جب تک وہ نہ بیٹھ گئیں۔ اُنھوں نے مُجھ سے میرا نام اور کلاس پوچھی۔

ابھی وہ کچھ اور پوچھنا چاہ رہی تھیں کہ رافِعہ آگئی۔ وہ بزرگ خاتون کو دیکھتے ہی کہنے لگی "اوہو دادو! آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ اُٹھیں۔ اندر جائیں۔ سب آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔"

مجھے رافِعہ کی اُن بُزرگ خاتون سے بدتمیزی برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے کہا "بُری بات ہے، رافِعہ۔ آپ اپنی دادی سے کس لہجے میں بات کر رہی ہیں؟"

رافعہ نے مُنہ بنا کر کہا "دادو ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں۔ جب بھی کوئی مہمان آتا ہے، یہ فوراً اُس سے اُلٹے سیدھے سوال جواب کرنے لگتی ہیں"۔ بُزرگوں سے ایسی بدتمیزی کا مظاہرہ میں نے اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال، رافعہ کی دادی تو چُپ چاپ ڈرائنگ روم سے چلی گئیں مگر مجھے رافعہ کے رَوَیّے سے بے حد تکلیف پہنچی تھی۔

اگلے دن اِسکول میں میں نے رافِعہ سے بِالکُل بات نہ کی۔ اُس نے مُجھ سے وجہ پوچھی تو میں نے اُسے صاف

صاف بتا دیا کہ چوں کہ وہ بزرگوں کی عزت نہیں کرتی، لہٰذا میری اور اُس کی دوستی ختم۔

رافعہ یہ سُن کر شرمندہ ہوگئی اور بولی "مجھے افسوس ہے، سامیہ۔ آیندہ تُمہیں مجھ سے ایسی شکایت نہ ہوگی"۔

چند روز بعد رافعہ میرے گھر آئی۔ میں اُس کے پاس بیٹھی تھی کہ اماں جی اندر آگئیں۔ رافعہ نے اُٹھ کر ادب سے انہیں سلام کیا۔ اماں جی نے سلام کا جواب دیا اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ جب رافعہ اپنے گھر چلی گئی تو اماں جی کہنے لگیں "سامیہ بیٹا، تمہاری دوست تو بزرگوں کا بہت ادب کرتی ہے"۔

"جی، اماں جی" میں نے مسکرا کر کہا۔

(پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

ننھا مجاہد

وسیم اقبال، نشتر کالونی لاہور

طاہر گُل ایک پھول سا بچہ تھا۔ اُس کی عمر بارہ سال تھی۔ وہ کشمیر کے اُس حصے میں رہتا تھا جسے آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ اُس کے ماں باپ غریب تھے۔ اور محنت و مشقت سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ اُس کی ماں بھیڑ کی اُون سے مختلف چیزیں بناتی تھی اور باپ لکڑیاں کاٹ کر شہر میں بیچتا تھا۔

طاہر گل اکثر گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کے کنارے کھیلنے کے لئے جاتا تھا۔ اُن کا گھر سرحد کے قریب ہی تھا اِس لئے فوجی بھی اُنہیں پہچانتے تھے۔ خصوصاً طاہر کی تو فوجیوں کے ساتھ اچھی خاصی دوستی تھی۔

وہ کبھی کبھار کھیلتے کھیلتے اُن خاردار تاروں کے آس پاس بھی نکل جاتا تھا، جن کے قریب پاکستانی فوجی کھڑے ہوتے تھے۔ طاہر گُل اکثر سوچتا تھا کہ آخر فوجی اُسے اِن خاردار تاروں سے آگے کیوں نہیں جانے دیتے۔ وہ جب بھی فوجیوں سے اِس بارے میں پوچھتا تو فوجی جواب میں کہتے "بیٹا، اُس طرف ہمارے دُشمن ہیں۔ اگر تم اُدھر گئے تو وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ تم اُس طرف مت جانا" اور طاہر بے چارہ سہم کر رہ جاتا۔

ایک دن طاہر ندی کے کنارے کھیل رہا تھا کہ اچانک اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ تیز رفتار ندی میں جاگرا۔ اُس نے بتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن باہر نہ نکل سکا۔ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

کچھ دیر بعد اُس کو ہوش آیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بُزرگ اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اسے ہر چیز دُھندلی دُھندلی نظر آ رہی تھی۔ جب صاف نظر آنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ سامنے دو آدمی کھڑے ہیں۔ اُن میں سے ایک کی عمر 30 سال کے قریب تھی، اور دوسرے شخص کی عمر 60 کے لگ بھگ تھی۔ طاہر گھبرا گیا۔ بولا "میں کہاں ہوں؟"

اُدھیڑ عمر شخص نے جواب دیا "بیٹے، تم کشمیر میں ہو"۔

طاہر نے یہ سُن کر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اُسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ کشمیر ہی میں ہے۔ اِتنی دیر میں وہ آدمی گرم دودھ لے آیا اور اُس نے طاہر سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور ندی میں کیسے گرا۔ طاہر نے اسے پوری بات بتائی۔ جب اُس نے یہ بتایا کہ اُس کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے تو دونوں آدمی کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ طاہر نے اُن سے دریافت کیا کہ وہ کیوں پریشان ہوگئے ہیں تو اُنھوں نے اُسے بتایا کہ وہ اِس وقت کشمیر کے اُس حصے میں ہے جو بھارتی قبضے میں ہے۔ بُزرگ نے طاہر کو بتایا کہ وہ ندی میں بہتا آ رہا تھا کہ اُن کی نظر اُس پر پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے اُنھوں نے اُسے باہر نکالا۔ طاہر کو وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جو اُس نے فوجیوں اور اپنے بابا سے سُنی تھیں۔ وہ گھبرا کر رونے لگا۔ لیکن اُن آدمیوں نے اُسے تسلی دی۔ طاہر کو باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے نام بھی بتائے۔ ادھیڑ عمر آدمی کا نام ساجد میر اور بُزرگ کا نام سیّد احمد تھا، اور وہ دونوں باپ بیٹا تھے۔ طاہر کو دودھ پی کر نیند آگئی اور وہ سوگیا۔

اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ مکان کا دروازہ زوردار آواز سے کُھلا اور چند بھارتی فوجی تیزی سے اندر گُھس آئے۔ طاہر ایک دم سہم گیا۔ اُس کی آنکھ شور سے کُھل گئی تھی۔ وہ دونوں آدمی بھی چونک پڑے۔ لیکن پھر سنبھل گئے اور بزرگ نے فوجیوں سے کہا "کیا بات ہے؟"

ایک فوجی جو وردی سے کیپٹن لگتا تھا' آگے بڑھا اور درشت لہجے میں بولا "کیا یہی وہ لڑکا ہے جو ندی میں بہ کر آیا ہے؟" بزرگ نے اِثبات میں سر ہلایا تو کیپٹن نے اپنے ساتھیوں سے کہا "اِس گھر کی تلاشی لو اور لڑکے کی بھی تلاشی لو۔ یہ کہیں پاکستان کا جاسوس تو نہیں؟"۔

فوجی تمام گھر میں پھیل گئے۔ ایک فوجی طاہر کی تلاشی لینے لگا۔ لیکن طاہر کے پاس کچھ ہوتا تو ملتا۔ اتنی دیر میں دوسرے فوجی بھی گھر کی تلاشی لے کر واپس آگئے۔ کیپٹن نے انہیں اشارہ کیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔ طاہر بُری طرح سہم گیا تھا۔ ساجد اور سیّد صاحِب نے اُسے پیار کیا اور تسلّی دی۔ اِس طرح اُس کا ڈر کچھ کم ہوا۔

اِس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب طاہر بالکل ٹھیک ہوگیا تھا۔ بھارتی فوجیوں کے ظلم و ستم کے قصّے سُن کر اُس کا دل سُلگ رہا تھا۔ ساجد اور سیّد صاحِب نے جب اُسے واپس آزاد کشمیر بھیجنے کی بات کی تو اُس کے ذہن میں وہ تمام واقعات گھومنے لگے جو اس نے ایک ہفتے کے دوران وادی میں دیکھے تھے۔ اُس کا دل اپنے کشمیری بھائیوں کی بے بسی اور اُن پر ٹوٹنے والے مظالِم پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اُس نے سیّد صاحِب سے کہا کہ وہ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتا ہے اور آزاد کشمیر نہیں جائے گا۔ سیّد صاحِب نے پہلے تو اُسے سمجھانے کی کوشش کی' لیکن جب اُنہوں نے اس کا جوش اور جذبہ دیکھا تو اس کی ضِد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جب سیّد صاحِب طاہر کو مُجاہدین کے کمانڈر احمد کے پاس لے کر گئے تو ایک بارہ سالہ بچّے کے مُنہ سے ایسی باتیں سُن کر وہ حیران رہ گیا۔ آخر صلاح و مشورہ کے بعد اس نے طاہر کو ایک اہم کام سونپنے کا فیصلہ کیا' اور اُسے بھارتی فوج کے بریگیڈیر کے گھر نوکر رکھوا دیا۔ جب طاہر نے بریگیڈیر کا اعتماد اچھی طرح حاصل کرلیا تو اس نے ایک رات اہم فوجی راز چوری کرلئے اور دیوار پھلانگ کر بھاگ نکلا۔ لیکن بنگلے کے گیٹ پر موجود پہرے داروں کی نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ اس کے پیچھے بھاگے۔

طاہر ایک خشک نالے میں چُھپ گیا۔ فوجی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں بھی آپہنچے۔ طاہر نے بھاگ نکلنے کی کوشش کی لیکن اِس مرتبہ وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ فوجیوں نے اُس پر فائر کھول دیا۔ گولی اُس کی کمر میں لگی۔ اب وہ اُس علاقے میں پہنچ چکا تھا' جہاں مُجاہدین نے اُس سے وہ کاغذات حاصِل کرنے تھے۔ مجاہدین نے جب بھارتی فوجیوں کو دیکھا تو اُنہوں نے اُن پر فائر کھول دیا۔ چند بھارتی فوجی مارے گئے' باقی دہشت زدہ ہوکر بھاگ نکلے۔

طاہر کا کافی خون بہ چکا تھا۔ اب اُس پر نِقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ نگاہ دُھندلانے لگی تھی۔ اُس نے اپنی قمیص سے کاغذات نکال کر کمانڈر کے ہاتھوں میں تھمائے اور کم زور آواز میں بولا "کمانڈر صاحِب! میں نے کشمیری ہونے کا حق ادا کردیا ہے۔ میں بھی ایک مجاہد ہوں"۔

کمانڈر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے طاہر کا سر گود میں رکھتے ہوئے کہا "ہاں' بیٹے تم بھی مجاہد ہو"۔

طاہر نے کمانڈر کی گود میں آخری ہچکی لی اور پھر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ (دوسرا اِنعام: 45 روپے کی کتابیں)

اِیمان داری کا پھل

عدنان اشرف اعوان' چک لالہ

پچھلے مہینے کی بات ہے۔ ایک دن میں اور میرا دوست واجد اِسکول سے چُھٹّی کے بعد گھر واپس آرہے تھے کہ اُس علاقے کا ڈاکیا' سائیکل پر سوار' خطوں کا تھیلا کندھے پر لٹکائے ہمارے قریب سے گزرا۔ کچھ آگے جاکر سائیکل اس کے قابو سے باہر ہوگئی اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش میں زمین پر آرہا۔ اِردگرد کے لوگ اس بے چارے پر ہنسنے لگے۔

اس طرح کے واقعات عموماً ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی سائیکل سے گر جائے' یا کسی کا پاؤں کیچڑ سے پھسل جائے تو لوگ بجائے اس کے کہ اس کی مدد کریں' دانت نکال کر ہنسنے لگتے ہیں۔ خیر' اُس وقت وہ ڈاکیا بھی اِسی صورت حال سے دوچار تھا۔ سب لوگ اُس پر ہنس رہے تھے۔

ڈاکیے کا تھیلا اُس کے کندھے سے گر گیا تھا' جس کی

وجہ سے کئی خطوط اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے اور وہ جلدی جلدی اُنہیں اکٹھا کر رہا تھا۔ اُس نے تیزی سے خط سمیٹ کر تھیلے میں ڈالے، سائیکل پر سوار ہُوا اور یہ جا وہ جا۔

جب ہم اُس مقام پر پہنچے جہاں ڈاکیے کی سائیکل گری تھی تو ہمیں کچھ فاصلے پر ایک خط پڑا نظر آیا۔ شاید ڈاکیا جلدی میں اُسے نہ دیکھ سکا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے اُٹھا لیا اور واجد سے کہا "ڈاکیا نہ جانے کب اِس علاقے میں آئے گا۔ اب یہ خط اپنی منزل تک تو پہنچنے سے رہا"۔

اِس پر واجد نے کہا "ہو سکتا ہے اس میں کسی کے لئے بہت ضروری پیغام ہو"۔ یہ کہہ کر اُس نے لفافے پر لکھے ہوئے پتے کو پڑھا اور بولا "جس جگہ کا پتا اِس پر درج ہے، وہ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ کیوں نہ یہ خط ہم وہاں پہنچا آئیں"۔

بھلا مجھے کیا اِعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بہانے سیر بھی ہو جائے گی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ شام کو یہ خط اُس گھر تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ خط واجد نے رکھ لیا اور پھر ہم اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

شام کو واجد مقررہ وقت پر میرے گھر آیا۔ خط اس کے پاس تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں روانہ ہوگئے۔ پہلے ہم اُس علاقے میں پہنچے، پھر گلی نمبر اور مکان نمبر دیکھتے دیکھتے آخر کار اُس مکان تک پہنچ گئے۔ اُس کے مین گیٹ پر جو تختی لگی تھی، اُس پر وہی نام پتا درج تھا جو اُس لفافے پر لکھا تھا۔ ہم نے منزل تک پہنچ جانے پر شکر ادا کیا۔ واجد نے مجھ سے کہا کہ کال بیل کا بٹن دباؤ۔

میں آگے بڑھ کر بٹن دبانے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھُلا اور ایک اَدھیڑ عمر کے صاحب نمودار ہوئے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھہر گئے۔ ہم نے جلدی سے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا اور ہمیں ایسے گھورا جیسے سوچ رہے ہوں کہ ہم اُن کے دروازے کے آگے کیا کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں کہ واجد نے فوراً لفافہ ان صاحب کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "کیا یہ آپ ہی کا خط ہے؟"۔

اُن صاحِب نے بھَنویں سکیڑتے ہوئے پہلے واجد کو اور پھر لفافے کو دیکھا۔ اِس کے بعد لفافہ واجد کے ہاتھ سے لے لیا اور اُس پر لکھا ہوا پتا پڑھنے لگے۔ پتا پڑھنے کے بعد اُنہوں نے پوچھا "خط تو ہمارا ہی ہے۔لیکن یہ تم تک کیسے پہنچا؟"

ہم نے اپنا تعارُف کرایا۔ پھر ہمیں ساری کہانی اُن صاحِب کو سُنانی پڑی۔ ساری بات سُن کر اُن کے چہرے پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی اور اُنہوں نے تعریفی لہجے میں کہا "بھئی واہ! تم نے تو بڑی ایمان داری دکھائی"۔

ہم واپس جانے کے لئے پر تول رہے تھے کہ انہوں نے کہا "ایک مِنٹ....." یہ کہہ کر اُنہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب واپس نکالا تو اُس میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ وہ نوٹ اُنہوں نے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تمہاری ایمان داری کا اِنعام ہے۔اِسے آپس میں تقسیم کرلینا"۔

واجد نے کہا "جناب، ہم نے انعام کے لئے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے تو اپنا فرض نبھایا ہے"۔

وہ صاحِب بولے "بھئی، جو کام تم نے کیا ہے، اِس زمانے میں کوئی اور ایسا کرنے کی زحمت نہیں کرتا۔ رکھ لو اِسے۔شاباش!"

اُن کے اِصرار پر واجد نے جھجکتے ہوئے نوٹ لے لیا۔ اُن صاحِب نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور ہمارے کندھے تھپتھپائے۔ ہم نے اُن سے اِجازت مانگی، ہاتھ ملایا اور واپس چل دِیئے۔ (تیسرا اِنعام: 40 روپے کی کتابیں)۔

ہماری چھٹیاں

صائمہ اکرم، صادق آباد

"ہم اِتنی لمبی چھٹیاں آخر کیسے گزاریں گے؟" حارث نے بچّہ پارٹی کو مُخاطب کر کے کہا۔

فیصل جُھنجلا کر بولا "اب تم نے یہ گھسا پِٹا سوال کیا، جو تم اِکیسویں مرتبہ کر رہے ہو تو میں اپنی باکسنگ کا مظاہرہ تمہاری طوطے جیسی ناک پر کر دوں گا۔ چھٹیاں ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا ہے اور یہ نواب صاحب ابھی سے اُکتا گئے"۔

ریما فا فٹ بولی "اور کیا۔ جب چھٹیاں نہیں ہوئی

تھیں تب یہ سوال کر کر کے کہ چھٹیاں کب ہوں گی، ہمارا بھیجا کھایا کرتا تھا"۔

طلحہ نے جب دیکھا کہ یہاں 1965ء کی جنگ کی یاد تازہ ہونے کا اندیشہ ہے تو اُس نے ریفری کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "پلیز، یہ بم باری ختم کی جائے۔ ہم نے یہ لان کانفرنس اِس لئے بُلائی ہے کہ ایک ایسی ترکیب اِختیار کی جائے کہ تین ماہ کی یہ چھٹیاں اِطمینان سے گزر جائیں"۔

سلمان نے سب سے پہلے مشورہ دینے کی کوشش کی۔ بولا "کیوں نہ لاہور جاکر چھٹیاں گزاری جائیں؟"۔

اُس کی یہ تجویز سُن کر فیصل دو فٹ اُوپر اُچھلا اور اپنی طوفانی طبیعت کے مُطابق غصّے سے بولا "سلّو یار، خدا کا شکر کرو میرے اِردگرد کوئی چیز نہیں ہے ورنہ میں نے تمہارا مٹکے جیسا سر توڑ دینا تھا۔ صبر کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ ہزار دفعہ لاہور جا چکے ہیں خبردار! جو اب کسی نے لاہور کا نام لیا"۔

فیصل کو غصے میں دیکھ کر علینہ ڈرتے ڈرتے بولی "کیوں نہ شاہینہ آنٹی کے گھر مری جایا جائے؟"۔

"کیا؟ شاہینہ آنٹی کے گھر؟ میری توبہ! بلکہ میرے باپ کی بھی توبہ اگر میں نے مری کا نام لینا تو دور کی بات، مری کی سائیڈ پر مُنہ بھی کیا۔ شاہینہ آنٹی کے گھر میں اور جیل میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ جیل بھی اُن کے گھر سے بہتر ہی ہے۔ ڈربے جیسا گھر ہے اُن کا۔ اُوپر سے یہاں نہ جاؤ، وہاں نہ جاؤ، یہ نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔"

حارث نے یہ تجویز بھی فوراً مُسترد کر دی۔

"میرا خیال ہے اِس مرتبہ کراچی کا چکر لگا آئیں" فیصل نے مشورہ دیا۔

یہ سُنتے ہی طلحہ کھڑے ہو کر بولا "ناں جی ناں۔ میں تو اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ مجھے ابھی مرنے کا کوئی شوق نہیں۔ وہاں تو روز گولیاں چلتی ہیں۔ اگر دہشت گردوں کے ہاتھ سے بچ بھی گیا تو پولیس پکڑ کر لے جائے گی، کیوں کہ میں شکل سے مشکوک لگتا ہوں"۔

طلحہ کے ساتھ ساتھ دوسرے بچّوں نے بھی اِس مشورے کو ریجکٹ کر دیا۔

"آہا! کیوں نہ رحیم انکل کے ہاں اسلام آباد جایا جائے؟" ریما نے ایک نئی تجویز پیش کر کے سب کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ مگر بچّوں کی اکثریّت نے یہ کہ کر اسلام آباد جانے سے اِنکار کر دیا کہ رحیم انکل بلا کے کنجوس ہیں اور وہ ہمیں سیر و تفریح کے لئے کہیں نہیں لے جائیں گے۔

"تو پھر آخر کہاں جایا جائے؟" سلمان نے مایوسی سے کہا۔

لان میں داخل ہوتے ہوئے بچّوں کے دادا جان کے کان میں یہ جُملہ پڑا تو اُنہوں نے ساری بات اِطمینان سے سُننے کے بعد کہا کہ اُنہیں یہ چھٹیاں گاؤں میں گزارنی چاہئیں۔ دادا جان کی یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ تین ماہ بعد جب وہ دادا جان کے گاؤں سے چھٹیاں گزار کر آئے تو اُن کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ دراصل اُنہوں نے دادا جان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اُن کے گاؤں کے غریب اور نادار بچّوں کو کتابیں خرید کر دی تھیں اور اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اُن کو بھی پڑھایا تھا۔ اِس طرح بہت سارے بچّوں نے پڑھنا لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے دادا جان نے بہت سے بچّوں کی پڑھائی کا خرچ اپنے ذمّے لیا تھا اور انہیں اِسکول میں بھی داخل کروا دیا تھا۔

ساتھیو، آپ بھی اپنے اِردگرد نظر دوڑائیں۔ آپ کو ایسے بہُت سے بچّے نظر آئیں گے جو تعلیم کا شوق رکھنے کے باوجود کسی مجبوری کی وجہ سے اپنا یہ شوق پورا نہیں کر سکتے۔ تو کیوں نہ آپ اپنی چھٹیاں فضول کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے تعمیری کاموں میں صرف کریں۔ اِس سے آپ کو دلی سکُون کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی بھی حاصِل ہوگی۔

(چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)

Sharjeel Ahmed

سلیم خاں گمی

موت کا کھیل

پنیر خان مجھے کئی سال پہلے لاہور میں ملا تھا۔ وہ اکیلا نہ تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی 'زیتون خانم' بھی تھی۔ پنیر خان کی عمر اس وقت چالیس سال سے کم ہوگی۔ اس کی بیوی کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دبلی پتلی تھی اور اس کا رنگ پیلا تھا۔ لیکن پنیر خان کا رنگ سرخ و سفید تھا اور وہ اچھے قد کاٹھ کا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ ڈاڑھی تھی جس سے اس کے چہرے کا رعب بڑھ گیا تھا۔

میں لاہور میو ہسپتال میں ایک دوست کا پتا کرنے گیا تھا۔ وہ ایک حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ حادثات کے شعبے میں دوست کا حال معلوم کر کے میں واپس آرہا تھا کہ ہسپتال کے ایک بنچ پر پنیر خان بیٹھا نظر آیا۔ اس کے ساتھ 'بنچ پر' زیتون خانم چادر اوڑھے لیٹی تھی۔

جب میں پنیر خان کے قریب سے گزرا تو اس نے میری طرف بڑا سا ہاتھ بڑھایا۔ اس کی ہتھیلی پر چار پانچ کھجوریں تھیں۔ "بابو' کھجور لے لو" اس نے رعب دار آواز میں کہا۔

یہ رمضان کا مبارک مہینا تھا اور افطاری کا وقت ہوگیا تھا۔ میں روزے سے تھا لیکن اپنے دوست کے حادثے کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس لئے یہ خیال نہ رہا کہ افطاری کا وقت ہوگیا ہے۔ میں نے پنیر خان سے دو کھجوریں لیں اور اس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔

"مہربانی آپ کی۔ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم چمن سے آیا ہے۔ چمن بلوچستان کا ایک شہر ہے۔ افغانستان کی سرحد پر ہے" پنیر خان بولا۔

"وہی چمن جس کے انگور بہت مشہور ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہ جی۔ چمن میں انگور نہیں ہوتی۔ قندھار سے آتی ہے۔" وہ بولا۔

"یہ کون ہے آپ کے ساتھ' چادر میں؟" میں نے گٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا نام پنیر خان ہے۔ اس کا نام زیتون خانم ہے۔ ہمارا بیوی ہے۔ بیمار ہے۔ ادھر ڈاکٹر کے پاس لایا ہوں۔ اسے کینسر ہے۔ امارے بلوچستان میں اس کا علاج نہیں ہے۔"

"ہسپتال کب آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر دس دن سے پڑا ہے۔ کوئی پوچھتا نہیں۔ داخلہ نہیں ملتا۔ ہم آؤٹ ڈور سے دوائی لکھواتا ہے۔ خریدتا ہے۔ کھلاتا ہے۔ مگر آرام نہیں آتا" پنیر خان پریشان ہو کر بولا۔

"رات کو کہاں سوتے ہو" میں نے پوچھا۔

"کہاں سوتا ہے؟ ادھر ہی سوتا ہے۔ برآمدے میں۔ لیکن کون سوتا ہے رات کو؟ جاگنا پڑتا ہے ساری رات۔ یہ بیمار ہے' اس لئے۔"

" کھانے پینے کا کیا انتظام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی انتظام نہیں۔ بازار سے نان اور پکوڑا خرید لیتا ہے۔ خود بھی کھاتا ہے۔ اس کو بھی کھلاتا ہے" وہ بولا۔

میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس وقت میں اور میری ماں بھاٹی گیٹ کے اندر، بازار سمیاں میں، رہتے تھے۔ ہمارے گھر میں تین کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا مہمان خانہ تھا جو میں نے پنیر خان اور زیتون خانم کو دے دیا۔

دونوں میاں بیوی ہمارے پاس پندرہ دن رہے۔ اس دوران میں لاہور کے تین بڑے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مرض لاعلاج ہے اور زیتون خانم کا بچ جانا معجزہ ہوگا۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ تب لاہور میں عمران خان کا شوکت خانم کینسر ہسپتال تعمیر نہ ہوا تھا۔ پنیر خان جب مایوس ہوگیا تو وہ زیتون خانم کو داتا دربار لے گیا اور دعا مانگی کہ اے اللہ! اسے شفا عطا فرما۔ اور پھر واپس اپنے گھر چلا گیا۔

میں ان دنوں ایک اخبار کا رپورٹر تھا۔ اس واقعے کے پانچ سال کے بعد مجھے میرے اخبار نے افغانستان کے شہر قندھار بھیجا تاکہ وہاں سے جنگ کی خبریں بھیجوں۔ اس وقت قندھار میں جنگ ہو رہی تھی اور لڑنے والے قبائلی سردار اور طالبان تھے۔ قبائلی سرداروں کے اپنے اپنے لشکر تھے۔ طالبان دینی مدرسوں کے طالب علم تھے۔ یہ دینی مدرسے افغانوں اور پٹھانوں نے بلوچستان اور سرحد میں قائم کیے تھے۔ میں نے قندھار جانے سے پہلے چمن میں ایک رات گزارنا مناسب سمجھا۔ قندھار جانے کے لیے چمن سے سرحد عبور کرنا پڑتی ہے۔

میں نے سوچا، مجھے پنیر خان سے ملنا چاہیے۔ چناں چہ میں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ آخر کار اسے ڈھونڈنے میں کام یاب ہوگیا۔ چمن کی باڑہ مارکیٹ کے پاس ہی اس کا گھر تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور میری بڑی آؤ بھگت کی۔ اس کے بیٹوں، گلستان خان اور بوستان خان، نے جھک کر مصافحہ کیا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ قہوہ پیتے ہوئے میں نے پنیر خان سے پوچھا "ان بچوں کی ماں کہاں ہے؟"

"وہ تو اللہ کو پیارا ہوگیا۔ ہم نے لاہور سے آکر بھی اس کا علاج کرایا، لیکن بے فائدہ۔ وہ ایک مہینے کے اندر اندر اللہ کے پاس چلا گیا۔ آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ پھر سوچا، آپ کو تو معلوم ہے۔"

"آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کے تین بیٹے ہیں: گلستان خان، بوستان خان اور چمن خان۔ چمن خان کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چمن خان بھی ماں کے پاس چلا گیا" پنیر خان نے بتایا۔ لیکن اس کے چہرے پر پریشانی نہ تھی۔

"کب؟ کیوں؟ کیسے؟" میرے منہ سے نکلا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جو اس وقت شروع ہوئی جب ہم چمن سے زیتون خانم کو لے کر لاہور روانہ ہوا" پنیر خان بولا۔

"اگر مناسب سمجھیں تو مجھے یہ کہانی سنائیے۔ شاید خدا نے مجھے اسی لئے چمن بھیجا ہے کہ میں آپ کی دکھ بھری داستان سنوں۔"

"یہ دکھ والی اتنی نہیں ہے جتنی بدلے والی ہے۔ ہمارا بیٹا چمن خان ہم سے چھن گیا۔ لیکن جن کی وجہ سے وہ چھن گیا' ہم نے ان سے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔ واللہ!" پنیر خان نے بلند آواز سے کہا۔

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"تم ہمارا بھائی ہے۔ تمہیں نہ بتاؤں گا تو کس کو بتاؤں گا" یہ کہ کر وہ چپ ہوگیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ کہانی کہاں سے شروع کرے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے جو کہانی سنائی' وہ میں اپنے لفظوں میں آپ کو سناتا ہوں۔ پنیر خان بلوچستان کے ایک بڑے اسمگلر کا قلی تھا۔ وہ چمن سے سامان اٹھاکر سرحد کے اس پار افغانستان لے جاتا اور افغانستان سے سامان چمن لے آتا۔ یہ کام رات کو ہوتا تھا۔ اگر اسمگلر بارڈر پولیس سے بات کرلیتا اور اسے کچھ پیسے دے دیتا تو اسمگلنگ کا کام دن کو بھی ہو جاتا۔ اس کام کے عوض پنیر خان کو کچھ مزدوری مل جاتی جس سے وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ زیتون خانم بیمار ہوگئی۔ وہ سرطان (کینسر) کی مریضہ تھی۔ چمن اور کوئٹے میں کینسر کے علاج کا کوئی ہسپتال نہ تھا۔ پنیر خان کے دوست دل بر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ زیتون کو لاہور لے جائے اور وہاں علاج کروائے۔ اگر زیتون کو دوا سے آرام نہ آئے گا تو اسے دعا سے شفا ہو جائے گی کیوں کہ لاہور داتا کی نگری کہلاتا ہے۔

پنیر خان لاہور روانہ ہوا تو چمن خان' گلستان خان اور بوستان خان کی دیکھ بھال کی ذمے داری دلبر خان نے سنبھال لی۔

"میں ایک مہینے کے اندر اندر واپس آجاؤں گا" پنیر خان نے دلبر خان کو بتایا۔

"تم ذرا فکر نہ کرو۔ میں ہر طرح چمن خان' گلستان خان اور بوستان خان کا خیال رکھوں گا" دلبر خاں نے کہا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ پنیر خان کے لاہور جانے کے سات دن بعد دلبر خان نے اس کے تینوں بچوں کو اپنے پیر' مرشد خان کے حوالے کردیا۔ مرشد خان ظاہر میں پیر تھا لیکن اصل میں وہ بچوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے غریب والدین کے بچے اغوا کراتا اور پھر نوکری کے بہانے ان کو عرب ملکوں میں بھجوا دیتا۔ بعض اوقات وہ یہ بچے لے کر خود دوبئ یا ابوظبی جاتا اور وہاں ان کو شیخوں اور بدو سرداروں کے ہاتھ فروخت کردیتا۔ یہ

شیخ اور بدو سردار ان بچوں کو اونٹ دوڑ میں استعمال کرتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ بچوں کو رسیوں سے جکڑ کر اونٹوں کے کوہانوں سے باندھ دیا جاتا اور جب اونٹ دوڑ شروع ہوتی تو موت کے ڈر سے یہ بچے چیختے چلاتے۔ ان کی چیخ پکار سے اونٹ ڈر جاتے اور خوف زدہ ہو کر خوب دوڑتے۔ پہلے اور دوسرے نمبر پر آنے والے اونٹ جیت جاتے اور ان اونٹوں کے مالک لاکھوں کماتے۔

جس طرح پاکستان میں گھڑ دوڑ ہوتی ہے' اسی طرح عرب ملکوں میں اونٹ دوڑ ہوتی ہے۔ پیر مرشد خان نے اپنے ایجنٹ دلبر خان سے پنیر خان کے تین بیٹے لئے اور ان کو ابو ظبی جاکر فروخت کردیا۔ دلبر خان اس کے ساتھ تھا۔

پنیر خان لاہور سے واپس آیا تو اسے نہ دلبر خان ملا اور نہ اپنے بچے۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ لیکن کیا کر سکتا تھا۔ اس کی بیوی زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ کچھ لوگوں نے اسے بتایا کہ دلبر خان بچوں کو لے کر کسی دوسرے گاؤں چلا گیا ہے۔ اس کے ایک دوست نے کہا کہ دلبر بچوں کو قندھار لے گیا ہے۔ پنیر خان کو امید تھی کہ اسے اس کے بچے مل جائیں گے۔ اسی امید میں وہ ایک دن ژوب میں پیر مرشد خان کے ڈیرے پر گیا۔ ژوب کا شہر کوئٹہ ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ پنیر خان کو معلوم تھا کہ دلبر خان مرشد خان کا مرید ہے۔ لیکن ژوب میں نہ پیر تھا اور نہ اس کا مرید۔

"پیر صاحب کہاں گئے ہیں؟" پنیر خان نے مرشد خان کے ایک خادم سے پوچھا۔

"پیر صاحب ابو ظبی گئے ہیں" خادم نے بتایا۔

"کیا کرنے گئے ہیں وہاں؟" پنیر خان نے پوچھا۔

ان کا پیر ابو ظبی میں رہتا ہے۔ وہ اس سے ملنے گئے ہیں" خادم نے کہا۔

"پیر صاحب اکیلے گئے ہیں یا کوئی اور بھی ان کے ساتھ گیا ہے؟" پنیر خان نے سوال کیا۔

"پیر صاحب کے ساتھ دو آدمی اور سات بچے گئے ہیں" خادم بولا۔

"جو دو آدمی پیر صاحب کے ساتھ گئے ہیں' ان میں سے ایک دلبر خان چمن والا ہوگا؟" پنیر خان نے کہا۔

"ہاں' ہاں دلبر خان پیر صاحب کا مرید ہے اور چمن میں رہتا ہے۔ وہ پیر صاحب کی خدمت میں تین لڑکے لایا تھا۔"

"کیا نام تھے ان بچوں کے؟" پنیر خان نے پوچھا۔

"چمن خان' گلستان خان اور بوستان خان۔ اب تم جاؤ۔ ہمارا مغز مت چاٹو" خادم نے تنگ آکر کہا۔

پنیر خان نے پچاس روپے کا نوٹ اس کے سامنے لہرایا اور بولا "اگر تمہارے پاس پیر صاحب کا ابو ظبی کا پتا ہو تو دے دو۔"

خادم نے اپنی تھیلی کھولی اور اس میں سے ایک چٹ نکالی اس نے چٹ پنیر خان کے ہاتھ میں تھمائی اور پچاس روپے کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ چٹ پر ابو ظبی کے شیخ شعبان کا پتا لکھا تھا۔

پنیر خان واپس چمن آیا تو زیتون خانم اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ وہ اسے دفنا کر ایک دکان دار کے پاس گیا جو جائیداد کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنا گھر اس کے پاس رہن رکھا اور سات ہزار روپے لے کر کراچی چلا گیا۔ پھر وہاں سے ابو ظبی روانہ ہوگیا۔

ابو ظبی پہنچ کر پنیر خان دو دن تک شیخ شعبان کا پتا معلوم کرتا رہا۔ لیکن کام یاب نہ ہوا۔ آخر تیسرے دن اسے شیخ شعبان کی حویلی کا پتا مل گیا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شیخ شعبان بدو سردار ہے اور اونٹ دوڑ پر شرطیں جیت جیت کر کروڑ پتی بن گیا ہے۔ اس کی حویلی کے ساتھ اونٹوں کا طویلہ تھا' جس میں اس کے ریس کے اونٹ تیار ہوتے تھے۔ یہیں اس کے نوکر چاکر رہتے تھے اور یہیں وہ بچے بھی رہتے تھے جن کو اونٹوں کے کوہانوں سے باندھا جاتا تھا۔ پنیر خان نے طویلے کے اندر گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں چار سال سے لے کر تیرہ سال کی عمر کے 20 بچے تھے' جو بنگلہ دیش' سری لنکا' بھارت اور پاکستان سے

اسمگل کرکے لائے گئے تھے۔ ان 20 لڑکوں میں چمن خان، گلستان خان اور بوستان خان بھی تھے۔ وہ باپ سے مل کر خوش ہوئے اور حیران بھی۔

لیکن وہاں نہ پیر مرشد خان تھا اور نہ دلبر خان۔ وہ بچوں کو شیخ شعبان کے ہاتھ بیچ کر پاکستان جاچکے تھے۔ پنیر خان نے طویلے کے مینیجر کے ذریعے شیخ شعبان سے ملاقات کی اور اس سے التجا کی کہ اس کے بچے واپس کردیئے جائیں۔

"میری بیوی فوت ہوچکی ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں، اپنے بچوں کو لینے کے لئے" اس نے شیخ شعبان سے کہا۔

"ہم تمہیں نہیں جانتے۔ بچے مرشد خان ہمارے پاس لایا تھا۔ اس کو ان کی قیمت دے دی گئی ہے" شیخ شعبان نے بڑی رکھائی سے کہا۔

"میں اپنے بچوں کے لئے اتنی دور سے آیا ہوں۔ آپ مہربانی کریں اور میرے بچے واپس کردیں"۔ پنیر خان بولا۔

"بچے واپس نہیں ہوسکتے۔ ہاں، تم چاہو تو تم کو اونٹوں کی خدمت کے لئے نوکر رکھا جاسکتا ہے" شیخ شعبان بولا۔

پنیر خان نے اس امید پر شیخ شعبان کے طویلے میں نوکری کرلی کہ وہ موقع پاکر اپنے بچوں کو لے جائے گا۔

پنیر خان کو نوکری کرتے ہوئے ایک مہینا ہوا ہو گا کہ اونٹ دوڑ ہوئی۔ جس میں اس کے دو بیٹوں چمن خان اور گلستان خان نے بھی حصہ لیا۔ ان دونوں کو اونٹ کے کوہان کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ دوڑ دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ ان کو بچوں کی جانوں کی پرواہ نہ تھی۔ کیوں کہ یہ ان کے اپنے بچے نہ تھے۔

اونٹ دوڑ شروع ہوئی۔ لوگوں کا شور بلند ہوا۔ بچوں نے چیخیں مار مار کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ اونٹ بے تحاشا بھاگنے لگے۔ جوں جوں بچوں کی چیخیں بلند ہوتیں، اونٹ ڈر کر اور تیز دوڑتے۔ وہ تیز دوڑتے تو بچے ڈرتے۔ وہ ڈر کر زیادہ چیختے تو اونٹ اور تیز دوڑتے۔ اسی کش مکش میں چمن خان کی رسیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ وہ اونٹ سے گرا اور دوڑتے ہوئے اونٹوں کے پیروں کے نیچے آکر کچلا گیا۔ اس کی ہڈیاں سرمہ ہوگئیں۔

بیوی کے بعد یہ دوسرا صدمہ تھا جس نے پنیر خان کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا کردیا۔ اس کا سارا وجود ریزہ ریزہ ہوگیا اور اس نے اپنے بچوں کی موت کا بدلہ لینے کے لئے قسم کھائی۔

دوسرے دن، صبح کو، جب شیخ شعبان کا مینیجر چمن خان کی موت کا معاوضہ دینے کے لئے پنیر خان کے پاس آیا تو پنیر خان نے کوئی بات نہ کی اور رقم قبول کرلی۔

پنیر خان کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ دو اونٹوں کو چارہ ڈالے، پانی پلائے، ان کی مالش کرے اور بیمار ہوں تو علاج کروائے، دوڑ سے سات دن پہلے ان کو خاص قسم کے کشتے کھلائے تاکہ وہ تیاری پکڑیں اور دوڑ جیتنے کے قابل ہوں۔ جس طرح بٹیر باز اپنے بٹیروں کو کشتے اور بادام کھلاکر تیار کرتے ہیں، اسی طرح پنیر خان دو اونٹوں کو تیار کررہا تھا۔

پنیر خان نے شہر کے سب سے بڑے پاکستانی حکیم سے رابطہ کیا اور اس سے ایک ایسی دوا لی کہ اگر اسے اونٹ کے چارے میں ڈال کر پندرہ دن تک کھلایا جائے تو اونٹ غصے سے پاگل ہوجائے گا اور جو بھی سامنے آئے گا، اسے چیرپھاڑ کر رکھ دے گا۔

اب پنیر خان نے کوشش کی کہ وہ اپنے دونوں اونٹوں کی خوب خدمت کرے۔ ان کے چارے، پانی اور آرام کا خیال رکھے۔ وہ روزانہ گلستان خان اور بوستان خان کو رسوں سے باندھ کر اونٹوں کے اوپر بٹھادیتا اور پھر ریت پر ان کو دوڑاتا۔ یہ ایک طرح کی ٹریننگ تھی۔

"بابا، آپ ان کو روز کیوں دوڑاتے ہیں؟" ایک دن گلستان خان نے پوچھا۔

"اس لئے کہ جب اصلی دوڑ ہو تو یہ خوب دوڑیں۔ تھک نہ جائیں" پنیر خان نے کہا۔

"بابا، آپ ان کو دوڑایا کریں۔ ہمیں ان پر کیوں بٹھاتے ہیں؟" بوستان خان نے پوچھا۔

"میں اس لئے تمہیں بٹھاتا ہوں کہ اونٹوں کو معلوم ہو کہ تم ان کے دوست ہو۔ تم نے دیکھا کہ وہ تمہارے ہاتھ چاٹتے ہیں۔ ایسی حالت میں تم جو کام چاہو گے، ان سے لے سکو گے۔" پنیر خان نے اپنے بیٹوں کو سمجھایا۔

دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر گلستان نے باپ سے پوچھا "کون سا کام بابا؟"

"اپنے بھائی چمن خان کا بدلہ، بدو سردار شیخ شعبان سے جس کے اونٹ تلے وہ کچلا گیا" پنیر خان بولا

دونوں بھائی چپ ہو گئے اور سوچنے لگے۔

جس روز دوڑ تھی، اونٹ بھی تیار تھے، ان کے سوار بھی اور پنیر خان بھی۔

شہر کے باہر میلے کا سماں تھا۔ دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ شرط لگانے والوں کے ہاتھوں میں نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ عرب شیخ اپنے بہترین لباس میں موجود تھے۔ شیخ شعبان کا اپنا ایک الگ اسٹینڈ تھا، جہاں اس کے کنبے کے لوگ، رشتے دار اور دوست کھڑے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شیخ شعبان کے بھی اونٹ تیار ہیں۔ لیکن اس میں سے دو اونٹ سب سے زیادہ تیار تھے اور یہی وہ دو اونٹ تھے جن کے سوار گلستان خان اور بوستان خان تھے۔

کل پچاس اونٹ دوڑ میں حصہ لے رہے تھے۔ ریگستان میں جھنڈے لگے ہوئے تھے جہاں سے مڑ کر ان پچاس اونٹوں کو واپس آنا تھا۔ لوگوں کے شور اور بچوں کی چیخ پکار میں اونٹ جھنڈوں کی حد سے واپس مڑے۔

اونٹوں کی گردنیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے جسم پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ کوہانوں کے ساتھ بچے چمٹے ہوئے تھے اور موت کے ڈر سے چیخ رہے تھے۔ لیکن ان پچاس بچوں میں دو بچے ایسے تھے جن کے دلوں میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔ اور یہ تھے گلستان اور بوستان۔ وہ اونٹوں پر یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے جسم کا حصہ ہوں۔ یہی دونوں اونٹ سب سے آگے تھے!

پنیر خان نے گلستان اور بوستان کو دیکھا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے دو مہینے محنت کی تھی تاکہ وہ چمن خان کا بدلہ لے سکے۔ وہ شیخ شعبان کے اسٹینڈ کے پیچھے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں سرخ کپڑا تھا۔

شیخ شعبان کے اسٹینڈ کے سامنے دوسرے اسٹینڈ کی طرح اونٹوں کو روکنے کے لئے ملازم کھڑے تھے تاکہ اونٹ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھیں کیوں کہ اس کے آگے شیخ، تماش بین اور عام لوگ کھڑے تھے۔

سب سے آگے گلستان اور بوستان کے اونٹ بگٹٹ چلے آرہے تھے۔ ان کا رخ شیخ شعبان کے اسٹینڈ کی طرف نہ تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پنیر خان نے سرخ کپڑا لہرایا گلستان اور بوستان نے سیٹیاں بجائیں اور دونوں اونٹوں نے رخ موڑا۔ ان کے پیچھے باقی 48 اونٹ بھی بھاگے چلے آرہے تھے۔ گلستان اور بوستان کے اونٹ پاگلوں کی طرح بلبلاتے ہوئے شیخ شعبان پر چڑھ دوڑے اور اسٹینڈ کے سامنے کھڑے ملازموں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھے۔ ملازموں نے دوڑ کر جان بچائی۔

شیخ شعبان اور اس کا ایک بیٹا کچلے گئے۔ اس کا دوسرا بیٹا اور کئی دوست بری طرح زخمی ہوئے۔ لیکن اس کے دو اونٹوں نے شرطیں جیت لی تھیں۔

دوسرے دن گلستان اور بوستان نے شرطوں میں سے اپنا حصہ لیا جو لاکھوں روپے تھا اور باپ کے ساتھ واپس پاکستان آگئے۔

اونٹوں پر دوڑ والے دن جو پاگل پن سوار ہوا، اس کی وجہ وہ دوا تھی جو پنیر خان ان کو پورا ایک مہینا چارے میں ڈال کر کھلاتا رہا تھا۔

تیسرے دن کراچی میں پنیر خان کو معلوم ہوا کہ ان دونوں اونٹوں کو گولی مار دی گئی ہے۔

بلوچستان آکر پنیر خان نے ایک رات دلبر کو گولی سے اڑا دیا!

لنکن کی پھلجھڑیاں

امریکا کے عوام اپنے جن لیڈروں کا نام نہایت عزت اور محبت سے لیتے ہیں، ان میں ایک لیڈر ابراہام لنکن بھی تھا۔ وہ آج سے 186 سال پہلے (1809ء میں) امریکا کی ایک ریاست 'کین ٹکی' کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب بڑھئی تھا اور یہ لوگ لکڑی کے ایک کیبن میں رہتے تھے۔

لنکن کی شکل و صورت اچھی نہ تھی، لیکن قدرت نے اسے دماغ بہت اعلیٰ عطا کیا تھا۔ اس نے اپنی ذاتی محنت اور شوق سے تعلیم حاصل کی اور پھر سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ 25 سال کی عمر میں وہ امریکی ریاست الی نوائے کی قانون ساز اسمبلی کا رکن چنا گیا اور 1846ء میں امریکی کانگرس کا ممبر منتخب ہوا۔ 1860ء میں اس نے صدارتی انتخاب میں حصہ لیا اور بھاری ووٹوں سے ریاست ہائے متحدہ امریکا کا سولہواں صدر چنا گیا۔

لنکن نے صدر بننے کے بعد اپنے عوام کی بھلائی کے بہت سے کام کیے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ امریکا میں غلامی کا خاتمہ تھا۔ اس نے صدر بنتے ہی غلامی کو خلاف قانون قرار دے دیا، اور اس طرح وہ لاکھوں حبشی (نیگرو) غلام آزاد ہوگئے جن سے ان کے سفید چمڑی والے آقا اپنے کھیتوں میں جانوروں کی طرح کام لیتے تھے۔ افسوس کہ امریکا کے اس شریف اور نیک دل صدر کو 1865ء میں، ایک ایکٹر' جان بوتھ' نے اس وقت گولی مار کر ہلاک کردیا جب وہ ایک تھیٹر میں ڈراما دیکھ رہا تھا۔

لنکن بہت زندہ دل اور حاضر جواب تھا۔ اس کے بہت سے لطیفے اور چٹکلے مشہور ہیں۔ چند لطیفے آپ بھی سنیئے۔

لنکن کو اپنی بدصورتی کا خود بھی احساس تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری سے کہا تھا "خدا کو معمولی شکل و صورت کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے خوب صورت لوگ کم اور معمولی شکل کے لوگ زیادہ پیدا کیے ہیں۔"

ایک دن لنکن کے چند دوست اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ لمبی ٹانگیں اچھی ہوتی ہیں یا چھوٹی ٹانگیں۔ انہوں نے لنکن کی رائے پوچھی تو وہ بولا "میرے خیال میں، ایک آدمی کی ٹانگیں اتنی لمبی ہونی چاہئیں کہ وہ زمین تک پہنچ جائیں۔"

ایک دن لنکن جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک شکاری ملا۔ اس نے بندوق کی نال لنکن کے سینے پر رکھی اور بولا "میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر میں نے کبھی کوئی ایسا آدمی دیکھا جو مجھ سے زیادہ بدصورت ہوا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

لنکن نے آہ بھر کر کہا "ٹھیک ہے، بڑے بھائی۔ اگر میں واقعی تم سے زیادہ بدصورت ہوں تو بے شک مجھے گولی مار دو۔"

لنکن نے قانون کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ لیکن چوں کہ اس کی شکل اچھی نہ تھی، اس لئے اسے مقدمے بہت کم ملتے تھے اور اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ بعض وقت تو اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ ہوتے تھے کہ وہ کسی کرائے کی گاڑی میں سفر کر سکے۔

ایک دن وہ اپنے کسی دوست سے ملنے پیدل اس کے گاؤں جا رہا تھا کہ اس کے پاس سے ایک گھوڑا گاڑی گزری۔ وہ گاڑی والے سے لفٹ لینا چاہتا تھا، لیکن اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں وہ انکار نہ کر دے۔

اس نے گاڑی والے سے کہا "بڑے بھائی، کیا آپ گاؤں جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں" گاڑی والے نے کہا "ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

لنکن بولا "کیا آپ، مہربانی کر کے، میرا یہ کوٹ وہاں لے جائیں گے؟"

"بڑی خوشی سے" گاڑی بان نے کہا "لیکن آپ اسے واپس کیسے لیں گے؟"

"میں اسے پہنے رہوں گا" لنکن نے جواب دیا۔

ایک دن ایک مضمون نگار اپنا ایک مضمون لے کر لنکن کے پاس آیا۔ مضمون بہت لمبا، خشک اور اکتا دینے والا تھا۔ پھر بھی لنکن بڑے صبر و سکون سے سنتا رہا۔ جب مضمون ختم ہوا تو مضمون نگار نے لنکن سے پوچھا "آپ کی رائے میں میرا یہ مضمون لوگ پسند کریں گے؟"

لنکن نے جواب دیا "میرے خیال میں جو لوگ اس قسم کی چیزیں پسند کرتے ہیں، وہ ضرور پسند کریں گے۔"

لنکن امریکا کا صدر بننے کے بعد بھی اپنے جوتوں پر خود پالش کرتا تھا، حال آں کہ صدارتی محل (وہائٹ ہاؤس) میں بیسیوں نوکر موجود تھے۔

ایک دن، صبح کو، امریکی سینٹ کا ایک ممبر، چارلس سم فر، لنکن سے ملنے وہائٹ ہاؤس آیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ امریکا کا صدر اپنے جوتوں پر خود پالش کر رہا ہے!

اس نے کہا "مسٹر لنکن! شریف آدمی اپنے جوتے خود پالش نہیں کرتے۔"

لنکن بولا "پھر وہ کس کے جوتے پالش کرتے ہیں؟"

(س۔ل)

R. L. No. 4756

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 12.00

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE

FEROZSONS EDUCATIONAL

FEROZSONS PRIMARY SCIENCE is a complete series of twelve systematically graded books, well suited to the educational needs of children in English Medium Schools worldwide.
The aim of this series is to present the fundamentals of science in a way which children can easily understand and assimilate. They will not only remember the facts but also remember that the learning of them was a joyful experience.
Each book is divided into a number of parts which cover the main areas of study and are colour-coded for easy reference.
All the books are richly illustrated in colour and each drawing has been specially chosen to complement and support the text.
Each book commences with an interest-stimulating quiz and ends with an extra-curricular exercise entitled 'Do You Know?'

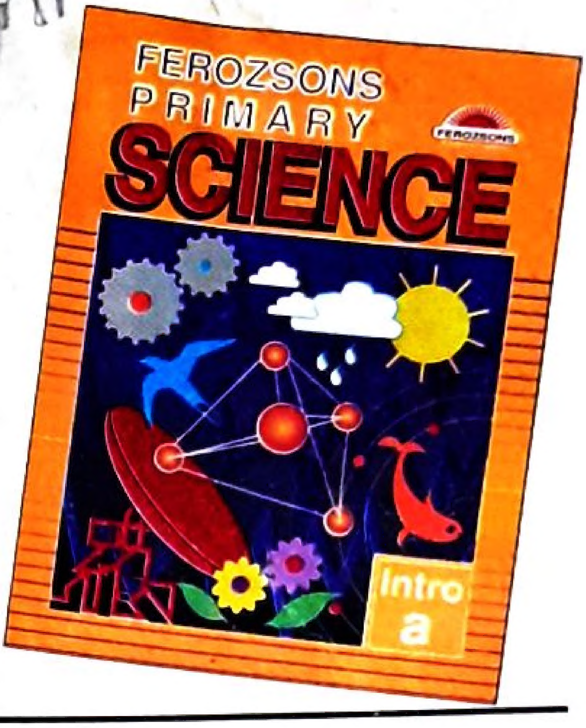

Intro a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Objects
96- 0 10141 2
Rs. 35.00

1a
Part 1 Human beings
Part 2 Things around us
Part 3 Living and non-living things
Part 4 Animals
Part 5 Animals and their babies
969 0 10092 0
Rs. 40.00

2a
Part 1 Human beings
Part 2 Health and safety
Part 3 Animals
Part 4 More about animals
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
969 0 10094 7
Rs. 40.00

Intro b
Part 1 Plants
Part 2 Food
Part 3 Light and Heat
Part 4 Movement
Part 5 Distance
Part 6 Earth and Sky
Part 7 Time
9 0 10142 0
Rs. 35.00

1b
Part 1 Objects
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
Part 7 Heat and temperature
Part 8 Light and shadow
Part 9 Time
969 0 10093 9
Rs. 40.00

2b
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Force and machines
Part 4 Energy
Part 5 Electricity
Part 6 Material and matter
Part 7 Time
969 0 10095 5
Rs. 40.00

3a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
Part 5 Magnetism
...re about animals
9 0 10...

4a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Living things and their needs
Part 4 Living things protect themselves
Part 5 Sound
Part 6 Magnetism
969 0 10098 X
Rs. 40.00

5a
Part 1 Human beings
Part 2 Healthcare and safety
Part 3 Animals
Part 4 Sound
969 0 10100 5
Rs. 50.00

3b
...ght and colour
...lants
...eat energy
...ht energy
Part 5 Force and energy
Part 6 Materials and matter
Part 7 Earth and atmosphere
Part 8 Time
969 0 10097 1
Rs. 40.00

4b
Part 1 Colours
Part 2 Plants
Part 3 Heat and temperature
Part 4 Electricity
Part 5 Time
969 0 10099 8
Rs. 40.00

5b
Part 1 Plants
Part 2 Animals
Part 3 Force and motion
Part 4 Heat and electricity
Part 5 Matter
Part 6 Earth and atmosphere
Part 7 Time
969 0 10101 3
Rs. 50.00

(Prices are subject to change without notice)

Also under publication: Available in 1994

Ferozsons Primary English
Ferozsons Primary Mathematics
Ferozsons Primary Atlas.

FEROZSONS (Pvt) LTD.
LAHORE RAWALPINDI KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Phones: 6301196–98 Fax: 62788
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phone: 563503 Fax: 56
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karach
Phones: 570527-570534-537730 Fax: 570534